بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دہشت گرد کون؟

(سوانح حیات)

آغا محمد مُبین
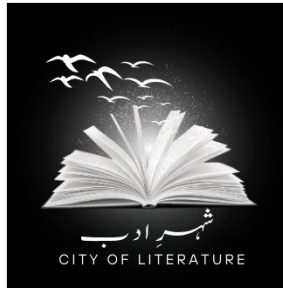
نام کتاب	:	دہشت گرد کون؟
مصنف	:	آغا محمد مُبین
ناشر	:	شہرِ ادب، لاہور
پرنٹر	:	ظفر پرنٹرز، لاہور
اشاعت اوّل	:	مئی 2024ء
کمپوزنگ	:	محمد وقاص
سرورق	:	
قیمت	:	1000روپے
سمندر پار	:	15ڈالر، 10پاؤنڈ، 35ریال
تقسیم کار	:	ٹیلنٹس بکس ہوم، S۔بلاک، ماڈل ٹاؤن، لاہور 0301-4055117

رابطہ کے لئے

0315-4220349

انتساب

اپنے والدین

حاجی آغا عصمت اللہ

اور

حاجن شمشاد بیگم

کے نام

فہرست

آغاز

میری والدہ کے مطابق میری تاریخ پیدائش الصبح میلادالنبی 1957ء ہے۔ بمقام چابک سواراں اندرون شہر لاہور میں ہوئی میری یادداشت کے مطابق میں نے ہوش سنبھالا تو میں چوٹا باقر میں رہتا تھا۔ اس پرانے طرز تعمیر والے مکان میں نیچے والے پورشن میں میرے تایا کی فیملی رہتی تھی جو کہ ہماری طرح ایک بڑا کنبہ تھا۔ میرے تایا آغا ناصر اپنے علاقے کے بااثر افراد میں سے تھے اور انہوں نے بلدیاتی الیکشن بھی لڑا ان کا انتخابی نشان پھول تھا انہیں مجھ سے بہت اُنس تھا اور گرمیوں میں وہ میرے لئے آم لاتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں آم بہت شوق سے کھاتا ہوں۔

خاندان آغا پیر محمد

میرے والد آغا عصمت اللہ اور تایا آغا ناصر کے درمیان عمر میں تقریباً پندرہ سال کا فرق تھا۔ میرے دادا کا نام آغا پیر محمد تھا اور وہ قیمتی پتھروں کا کام کرتے تھے۔ ہماری ذات تو بنیادی طور پر کشمیری تھے مگر ہم آغا کے سرنام سے پکارے جاتے ہیں۔ میرے دادا کو احتراماً آغا صاحب پکارا جاتا تھا۔ اس طرح یہ آغا والد صاحب ہم سب بھائیوں کے ناموں کے شروع میں لگ گیا۔ سنا ہے کہ میرے دادا آغا پیر محمد کا بہت رعب و دبدبہ تھا اور اہل محلہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے دادا اکثر ایران، افغانستان اور ہندوستان کے امراء نوابوں سے قیمتی پتھروں کا کاروبار کرتے اور کئی کئی ماہ ان ممالک کے دوروں پر رہتے اور جب ان کی واپسی لاہور ہوتی تو وہ سازوسامان محلے داروں میں تقسیم کرتے ۔جس میں میرے والد صاحب بھی ان کے ساتھ شامل ہوتے اور اس طرح وہ محلے میں خوشیاں بانٹتے۔

میرے والد آغا عصمت اللہ سے بہت چھوٹے تھے کہ ان کے والد آغا پیر محمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے دادا کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو میرے تایا نے عیش وعشرت میں خرچ کیا اور سنا ہے کہ وہ ایک مشہور گائیکا کے شیدائی تھے اور اکثر ان کی محفل میں رہتے۔ اس طرح تمام جائیداد ان ہی خرابوں کی نذر ہو گئی اور میرے والد صاحب کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے بہت محنت کرنا پڑی اور چھوٹی عمر میں اُنہیں خرادیوں کا کام کرنا پڑا۔

بسم اللہ مارکیٹ اعظم کلاتھ مارکیٹ، لاہور

انہیں لوگ مستری کے نام سے پکارنے لگے۔ کیونکہ وہ محنتی تھے اور ان میں Initiative تھا تو انہوں نے وزیر خاں مسجد میں کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا اور بعد میں ہمارا ایک آبائی مکان جو کہ اعظم کلاتھ مارکیٹ میں تھا میں کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت برکت دی بعد میں اس مکان کو گرا کر نئی مارکیٹ بنائی جس کا نام ”بسم اللہ مارکیٹ“ رکھا۔ میرے والد مرحوم عاشق رسولؐ تھے۔ اس لئے وہ اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھتے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

شادباغ نقل مکانی

شادباغ میں ہم نے رہائش کرایہ کے مکان نمبر 144 میں رکھی اور ہم سب بھائی بہنوں کا بچپن وہیں گزرا۔ ہم سات بھائی اور دو بہنیں تھے۔ ان کے علاوہ ہماری تین بہنیں پیدائش کے فوراً بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یوں ہم سات بھائی اور دو بہنیں حیات رہے۔ سب سے بڑے بھائی کا نام آغا محمد تنویر پھر ملیحہ عصمت، آغا محمد ندیم، آغا محمد ولید، آغا محمد علیم، آغا محمد مبین راقم، آغا محمد وسیم، آغاز محمد نوید اور سمعیہ عصمت۔ ہم بھائی بہنوں میں عمر کا زیادہ فرق نہیں تھا۔ بمشکل سال دو سال۔ مجھے خواب کی طرح 1965ء کی جنگ یاد ہے۔ اس وقت ہم شادباغ رہائش پذیر تھے اور ہمارے گھر کے سامنے کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ جنگ کے دنوں میں ہم اہل محلہ مرد حضرات گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے اور ساری رات وہیں گزارتے۔ یوں گراؤنڈ نزدیک ہونے کی بناء پر ہمیں کرکٹ کا بہت شوق تھا۔ میرا بڑا بھائی تنویر اننگز کا آغاز کرتا اور وہ بہت دیر تک وکٹ پر رہتا اور بہت کم سکور بناتا۔ اس کا آئیڈیل حنیف محمد تھا۔ امپائر کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ میرے بھائی کو ایل بی ڈبلیو آؤٹ دے کیونکہ وہ پہلے سے ہی ایمپائر کو دھمکا

دیتا۔

بسنت کا تہوار

مجھے یاد ہے ہمارے اس گھر میں بسنت کا تہوار بہت اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا اور ہم سب اہل خانہ کو بمعہ تایا کی فیملی کو بسنت کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ کئی دن پہلے پتنگوں اور ڈوروں کی خریداری شروع ہو جاتی اور ہمارا سونے والا کمرہ ان سے بھر جاتا۔ بسنت والے دن میری والدہ گجریلا ضرور بناتی جو کہ ایک بہت بڑے دیگچے میں بنتا تاکہ پندرہ بیس افراد سیر ہو کر کھا سکیں۔ ہم اپنے تایا کی فیملی سے کیوں علیحدہ ہوئے تو کسی بات پر تایا کی بیٹی جس کا عرف عام کالو تھا سے جھگڑا ہوا اور اس نے میری پیٹھ پر بہت شدت سے کاٹا تو یہ بات ہم دونوں خاندانوں کے درمیان وجہ تنازعہ بنی اور ہم ان سے الگ ہو کر شاد باغ آ گئے۔

بچپن کے واقعات وحادثات

شادباغ میں میری والدہ کی سہیلی تھی اس کے تین بچے تھے جن میں سے فریحہ نامی سے میری بڑی دوستی تھی اور ہمارا بچپن ان کے گھر آنا جانا بہت تھا۔ ہمارے ہمسایہ حاجی صاحب کی تین بیٹیاں تھیں جو ہمیں قرآن پاک اور درسی کتب پڑھایا کرتی تھیں۔ان کے گھر انگور کی بیل تھی جس میں موٹے کالے انگور ہم بہت شوق سے کھاتے۔ حاجی صاحب کے گھر سے اگلا گھر گنجو کا تھا،ان کے امرود اور انگور بہت مزے دار ہوتے۔ایک دن میں اور ولید امرود توڑ رہے تھے گنجو کی والدہ نے دیکھ لیا اور نیچے سے مجھے لمبے بانس سے مارنے لگی۔ میں نے مشکل سے اس سے جان چھڑائی اور ولید اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ اسی طرح میں ایک دن گنجو کے گھر سے انگور توڑ رہا تھا کہ گنجو کی والدہ کو معلوم ہو گیا اور وہ چھت پر براجمان تھی۔ میں جھولی بھر انگور لئے ان کے پانی والی ٹینکی کے اندر چھپ گیا چونکہ پانی ٹھنڈا تھا تو میرا پیشاب نکل گیا کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ گنجو کی والدہ چلی گئی ہیں تو میں باہر نکلا اور فوراً گھر انگور لئے پہنچا جو کہ سب نے کھائے اور مجھے یاد آیا کہ میرا تو پانی والی ٹینکی میں پیشاب نکل آیا تھا۔ میرے بتانے پر میرے بھائیوں نے میری بہت پٹائی کی کہ تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یوں میں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصادق ہو گیا۔

ہم تین بھائیوں ولید،علیم اور مبین راقم کو والد صاحب نے شادباغ بٹی کے سکول داخل کروادیا۔ بڑا بھائی ولید پڑھائی سے دور بھاگتا تھا اور ہم دونوں کو ترغیب دیتا کہ ہم سکول کے شروع ہوتے ہی بھاگ جائیں گے۔ یوں ہم تینوں مین گیٹ کے قریب بیٹھ جاتے اور جوں ہی پریڈ شروع ہوتی ہم تینوں گیٹ سے نکل کر باہر بھاگ جاتے اور ہمارا مانیٹر جس کا نام عارفی عرف ٹینڈا تھا۔ ہمارا پیچھا کرتا تا کہ وہ ہمیں پکڑ کر

واپس سکول لے جا سکے ،لیکن ہم اس کی خوب پٹائی کرتے اور وہ روتا ہوا واپس چلا جاتا۔ شکایت پر ہمارے والد صاحب ہمیں خوب مارتے اور ولید نے میرے والد صاحب کو کہہ دیا کہ وہ نہیں پڑھنا چاہتا پھر دو بھائیوں علیم اور مجھے ایم سی پرائمری سکول شاد باغ ڈال دیا جہاں ہمارے ایک استاد تھے جو" ہورا "مارنے یعنی گھونسا مارنے میں بہت مشہور تھے۔ مجھے آج بھی ان کی جابرانہ شکل یاد ہے۔ گھنگھریالے بال اور تندرست وتوانا جسم یاد ہے۔

میں چونکہ بہت شرارتی تھا اس لئے مجھے کھِٹ بھوتکہتے تھے اور عرف عام میں میرا نام" اَ کا "تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے (والی گراؤنڈ میں) گرلز سکول تھا اور ابھی اس کی دو منزلیں بمشکل مکمل ہوئی تھیں تو میں پتنگ لوٹنے سکول کی دیوار پر جو کہ دوسری منزل پر تھی چڑھا اور جونہی میں نے دوڑ پکڑی میں دھڑام سے نیچے گرا۔ میری خوش قسمتی کہ میں ریت کے ڈھیر پر گرا اور بچ گیا۔ حالانکہ اس ریت کے اردگرد اینٹیں، سریا اور بجری بھی پڑی تھی۔ میرے محلے والوں نے شور مچایا کہ" اَ کا" گر کر مر گیا ہے۔ میں روتا ہوا اپنے گھر ماں کے پاس پہنچ گیا۔

دوسرا واقعہ چھت سے گرنے کا یوں ہوا کہ میں ایک زیرِ تعمیر مکان جو کہ ہمارے گھر کے قریب تھا کبوتر پکڑنے کے لئے باہر نکلیں اینٹوں پر آہستہ آہستہ چڑھ رہا تھا تا کہ کبوتر کو خبر نہ ہو اور جونہی میں نے کبوتر کی دُم پکڑ لی تو ایک اینٹ اپنی جگہ سے نکل پڑی اور میں دوسری منزل سے نیچے گر پڑا اور مجھے بہت چوٹیں آئیں مگر میں نے کبوتر کو نہ چھوڑا۔

میرے والد صاحب اکثر کراچی کاروباری سلسلے میں جاتے تھے تو ان کے ایک پارٹنر غوری صاحب ہوتے تھے۔ والد صاحب کی یہ عادت تھی کہ جو کھلونے وہ ہمارے لئے لاتے وہی غوری چچا کے بچوں کے لئے بھی لاتے تو وہ بارہ کے قریب پٹاخے والی بندوقیں لائے اور ہم نے انہیں کھیل کھیل میں سب کو خراب کر دیا۔ جب والد صاحب نے کہا کہ مجھے چھ بندوقیں دو تا کہ میں غوری کے بچوں کو دے سکوں تو انہیں معلوم ہوا کہ ہم نے خراب کر دی ہیں تو ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اب ہماری خیر نہیں تو ہم سب لحافوں میں چھپ گئے جب والد صاحب ہمارے سونے والے کمرے میں آگ بگولہ اوپر آئے تو ان کے ہاتھ میں کفگیر تھی۔ میں لحاف کو اوڑھے دیکھ رہا تھا تو جونہی وہ کفگیر اٹھا کر مارنے لگے یہ سمجھ کر کہ وہ تنویر ہے میں نے فوراً لحاف ہٹا کر انہیں بتایا کہ یہ تو سمعیہ چھوٹی بہن ہے اور تنویر دوسرے بستر میں ہے تو یوں سمیعہ بچ گئی اور بعد میں میرے والد صاحب نے سمعیہ کو اٹھا

کرا الگ کر دیا اور ہمیں لائن حاضر کر کے کفگیر سے خوب مارا کہ ہمیں دادی اماں یاد آ گئی۔

میرے والد مرحوم اگر چہ بہت پیار کرنے والے تھے مگر جب انہیں غصہ آتا تو وہ اس کا یوں اظہار کرتے اور ہمیں خوب مارتے۔ایک دن جب انہیں ہمارے اساتذہ نے جب بہت شکایات ہمارے متعلق لگائیں تو انہوں نے گھر آ کر غصہ میں ہماری پتلونیں اور کتابوں کو نذر آتش کر دیا۔بعد میں انہیں احساس ہوا کہ وہ غصہ میں کیا کر بیٹھے ہیں۔

یونیسیکو ڈاکومنٹری

میری امی کے رشتہ کے دار نصیر انور اخبار "مشرق" میں "جھوٹی باتوں" کے عنوان سے کالم لکھتے تھے جو کہ مختلف ممالک کے بچوں کھیلوں کے بارے میں فلم بنا رہے تھے نے ہم سب بھائیوں کو ساتھ لیا اور ہم کھیتوں میں تھے چلے گئے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر کے قریب ہی کھیت تھے وہاں ہم نے ٹینڈوں والے کنوئیں کے قریب "لوکا چھپا کی والا" کھیل کھیلا اور "پٹھوں گول گرم" لڑکے بال سے ٹھیکریاں پر نشانے لگانے والا کھیل کھیلا۔ یہ سب کچھ گورے ریکارڈ کر رہے تھے۔ خواہش ہے کہ وہ فلم میں دیکھ سکوں تو بچپن کی یادیں تازہ ہو جائیں۔

6 جناح کالونی

مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں ہم کب شادباغ سے سمن آباد شفٹ ہوئے مگر 1965ء کی جنگ کے بعد ہم نے رہائش سمن آباد 6 جناح کالونی میں رکھی۔ یہ ایک دس مرلے کا مکان تھا اور اس کے قریب اِندر نگر، بسطامی روڈ ہمارے والد صاحب کی بالوں کی فیکٹری تھی۔ جس کا نام Cooperators International Traders تھا، جس میں انسان بالوں سے وگیں بنتی تھی میرے والد صاحب میں Initiative تھا اور انہوں نے یہ کام غوری چچا کے بھائی توفیق غوری سے مل کر شروع کیا جو بعد میں علیحدہ ہو گیا اور میرے والد کے ساتھ شفیع ماموں اور ناصر ماموں ساتھ مل گئے۔ میرے والد صاحب چونکہ ان پڑھ تھے اس لئے انہیں پڑھے لکھے افراد کی ضرورت تھی جو بیرون ملک خط و کتابت کر سکیں۔ یوں میرے ماموں ناصر تو سگے ماموں تھے جبکہ شفیع صاحب ہمارے عزیزوں میں سے تھے۔ ہم سب بھائیوں کو ماموں شفیع نے گھریلو تعلیم دی اور وہ انگلش بہت اچھی پڑھاتے تھے اور امریکی بنک میں کام کرتے رہے تھے۔ ماموں شفیع نے کمپنی کا نام کواپریٹرز انٹرنیشنل ٹریڈرز رکھا اور اس کمپنی کے دفاتر

مختلف ممالک میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم بالوں کی ایکسپورٹ کے کام کو بلیک گولڈ کہتے تھے۔ یعنی اس میں بہت نفع تھا۔ ہماری فیکٹری دو جگہوں پر مشتمل تھی ایک اِندر نگر کے شروع میں اور دوسرا بڑا حصہ اِندر نگر کے آخر میں تھا جس کے بائیس کمرے تھے اور یہ تقریباً آٹھ کینال میں تھی اور تقریباً 22 سو کے قریب مرد و خواتین کام کرتی تھیں۔ ہم بسطامی روڈ بالوں والی فیکٹری والے مشہور تھے اور آج بھی پرانے لوگ ہمیں اسی نام سے پہچانتے ہیں۔ ہماری فیکٹری میں اکثر غیر ملکی مہمان آتے تھے جن میں فرانس، جرمنی اور امریکہ کے باشندے شامل ہوتے۔ ہمارا سامان بذریعہ جرمن، ایئر لائنز بیرون ملک جاتا ہماری فیکٹری میں کچھ عرصہ میجر شریف جو کہ شبیر شہید اور راحیل شریف کے والد محترم تھے نے بحیثیت ڈائریکٹر کام کیا۔ مجھے خواب کی طرح یاد ہے میجر شبیر شہید نشان حیدر اپنے والد صاحب مرحوم کو ہماری فیکٹری چھوڑنے آتے تھے۔

ایبٹ آباد برائے غرائی

ایک مرتبہ میرے والد مرحوم نے غرائی کے لئے مجھے اور وسیم کو ایبٹ آباد بھیجا۔ ایسا تھا کہ والد مرحوم اعظم مارکیٹ میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے تو انہوں نے کہا کہ اگر پیسے لے آئے تو تم دونوں کو انعام دوں گا۔ وہ رقم والد کی کافی عرصہ سے پھنسی ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھائی اصبح ایبٹ آباد پہنچ گئے اور ابھی کپڑا مارکیٹ کھلی بھی نہ تھی کہ ہم وہاں پہنچ گئے۔ دکانیں ٹین کی بنی ہوئی تھیں اور وہاں قریب ہی ایک چشمہ بہتا تھا ہم کافی دیر تک اس دوکاندار کا انتظار کرتے رہے اس کو معلوم ہو گیا کہ لاہور سے دو لڑکے رقم لینے آئے ہیں اور وہ غائب ہو گیا ہم نے ساری مارکیٹ کو بتا دیا کہ ہم پیسے لینے آئے ہیں اور لے کر جائیں گے چاہیں ہمیں یہاں کئی دن رہنا پڑے تو یہ بات اس دکاندار کو بھی معلوم ہو گئی اور اس کو دکان کھولنا پڑی اور ہمیں اس نے پندرہ ہزار روپیہ دیا۔ ہم وہاں سے سیدھا مری گئے اور کچھ دن وہاں ہوٹل میں ٹھہرے وہاں ہماری ملاقات عارف نقاش جو کہ ٹیسٹ کرکٹر تھا خاور اور سہیل سے ہوئی اور راقم نے وہاں تاش بھی کھیلی۔ مری میں زیادہ دن قیام کرنے سے ہمارے کافی پیسے خرچ ہو گئے۔ لاہور آ کر والدہ کو بتایا کہ ہم زیادہ پیسے خرچ کر آئے ہیں۔ والد صاحب کے غصہ اور مار سے بچائیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے میرے والد مرحوم کا غصہ ٹھنڈا کیا اور ہماری جان بخشی ہوئی۔

لفتھانسا ایئر لائنز کے عملہ کی دعوت (Lufthansa air lines)

جب کبھی کوئی نئی فلائٹ لفتھانسا کی کسی دوسرے ملک کے لئے شروع ہوتی تو ہمیں بحیثیت

کلائنٹ ایئر لائنز والے ضرور فری ٹکٹ دیتے اور یوں میرے رشتہ کے ماموں شفیع دومرتبہ دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کر چکے تھے۔ میرے والد صاحب ان پڑھ ہونے کی وجہ سے بیرون ملک نہ جا پاتے اور انہیں یہ خواہش تھی کہ میرے بچے ضرور پڑھیں۔

ایک مرتبہ ہمارے گھر واقع جناح کالونی لفتھانسا ایئر لائنز کی ایئر ہوسٹس میرے والد کے دوست پراچہ کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ ہم نے انہیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ میری والدہ نے بڑے اہتمام سے بریانی، قورمہ اور دیگر پاکستانی کھانوں کے علاوہ فرنی بھی پکائی ہوئی تھی جس پر چاندی کے ورق تھے۔ وہ جب فرنی کھانے لگی تو اس نے استفسار کیا کہ چمکیلی چیز کیا ہے تو میرے ماموں شفیع نے بتایا کہ خالص سلور (چاندنی) ہے تو وہ بہت حیرانی کے ساتھ بولی کہ تبھی پاکستانی اتنے مضبوط ہیں۔ ہمارے گھر لفتھانسا کے اس وقت کے انچارج لاہور قیوم صاحب ہمارے گھر آئے، ان کا تعلق گلگت سے تھا تو دوپہر کے کھانے کے بعد جب ہم نے انہیں پھل کھلایا تو ان کے ڈیڑھ سال کے بچے نے چھ کیلے کھا کر ہم سب کو حیران کر دیا۔ وہ ماشاء اللہ بہت صحت منداور توانا بچہ تھا۔

کواپریٹرز انٹرنیشنل کرکٹ کلب

فرینڈز کالونی میں ایک بڑا پلاٹ تھا چونکہ میرے والد صاحب کو کرکٹ سے لگاؤ تھا۔ اس لئے میرے والد نے کمپنی کے نام پر کرکٹ کلب بنائی جس کے منیجر غوری صاحب اور ممبران میں اختر بھیا، آغا تنویر، آغا ندیم، آغا ولید، سمیع اور محلے کے دوسرے نوجوان بھی شامل تھے اور اس ٹیم نے کافی میچ جیتے۔ اس ٹیم کی تمام فنانسنگ میرے والد مرحوم کرتے تھے۔ آج کل اس پلاٹ پر گھر تعمیر ہو چکے ہیں اور وہاں بھٹی برادران کے گھر آباد ہیں۔

ہمارا انسانی بالوں کی ایکسپورٹ کا کام عروج پر رہا اور اس کا دورانیہ 1962ء سے 1974ء تھا۔ بعدازاں جاپان نے مصنوعی بال بنانا شروع کر دیئے اور ہمارے پاس سٹاک شدہ مال بہت زیادہ تھا اور گاہک چاہ رہا تھا کہ ہم ریٹ کم کریں۔ اس طرح نفع بخش کاروبار نقصان میں چلا گیا اور ہماری خاندانی مالی حیثیت کم ہونے لگی۔ ہمیں جناح کالونی والا گھر چھوڑ کر اِندر نگر بسطامی روڈ والی فیکٹری رہائش پذیر ہونا پڑا۔ بڑی فیکٹری جو کہ ڈاکٹر محبوب سے خریدی تھی اسے واپس کرنا پڑی اور دوبارہ اعظم مارکیٹ میں میرے والد صاحب کے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ میرے تین بھائی ندیم، ولید اور

علیم کپڑے کے کاروبار میں مصروف ہو گئے اور پھر سے ہمارے حالات کچھ بہتر ہونے لگے۔

داخلہ گلوب ماڈل سکول سمن آباد

میرا بھائی علیم جو صحیح معنوں میں بانکا تھا، ہر جمعہ نیا جوڑا پہنتا اور جمعہ کو خوب انجوائے کرتا نہایت شوقین مزاج تھا۔ شادباغ سے سمن آباد منتقلی کے بعد علیم، راقم، وسیم، نوید اور ملیحہ باجی کو گلوب سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میرا داخلہ جماعت اول میں ہوا اور میں بہت نالائق تھا اس لئے میری استانی بلقیس مجھے اینٹ پر بٹھاتی اور مجھے انگلش پڑھاتی۔ میری کلاس فلوز میں شباب کیرانوی فلمساز و ہدایتکاری کی بیٹی ناہید شباب اور رفعت گل بھی تھی۔ بعدازاں میں نے محنت کر کے اپنی جماعت میں پوزیشن بہتر کی اس میں شفیع ماموں کا زیادہ ہاتھ تھا۔ گلوب سکول میں ایک مرتبہ خوش نویسی کا مقابلہ ہوا جس میں مجھے ٹیچر نے اوّل قرار دیا اور کہا کہ پرنسپل صاحب کو اپنی پوزیشن بتاؤ۔ دوم اور سوم آنے والی دو طالبات تھیں۔ انہوں نے مجھے پس پشت ڈال کر پرنسپل کو بتایا کہ وہ فرسٹ اور سیکنڈ اور میں (راقم) تھرڈ ہوں اور میں ان کے دروغ گوئی پر ان کا منہ دیکھتا رہا۔

ہماری ایک ٹیچر تھیں جن کا نام ناصرہ تھا۔ ان کے شوہر پی آئی اے میں تھے اور سکول والوں نے پروگرام بنایا کہ ہم سب تاریخی مقامات کی سیر کو جائیں گے اور ایئرپورٹ کا دورہ بھی کریں گے۔ ہم تین لڑکوں عزیز الرحمن، ندیم اور راقم کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی کہ ہم طالبات کا خیال رکھیں گے۔ جب ہم شالیمار باغ پہنچے تو تمام لڑکیاں بشمول اساتذہ جو تمام خواتین تھیں، بے قابو ہو گئیں اور ہم تینوں نگران بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

ہمارے ساتھ ایک لڑکا ہمایوں پڑھتا تھا جو کہ عمر میں ہم سب کلاس فیلوز سے بڑا تھا اور نظر کا چشمہ پہنتا تو وہ ایک دن کلاس اٹینڈ کر رہا تھا تو ہماری ٹیچر نسیم کتاب لئے پڑھتے پڑھتے کلاس کے ایک سرے سے دوسرے سرے کا چکر لگاتیں لیکن جب وہ کلاس کے آخر ہمایوں کے پاس پہنچتیں تو وہاں تھوڑی دیر رک کر اپنی عینک اتار کر نیچے ہمایوں کی طرف دیکھتیں تو ہمایوں کے پاس ایک بہت شریر لڑکا وسیم بیٹھتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے تو معلوم ہوا کہ ہمایوں جلوہ افروز ہیں تو وسیم نے اسے بتایا کہ سرکار اپنا ستر چھپاؤ۔

1971 ٹیوٹا کرولا کار

نئی کار ٹیوٹا کرولا میں ایک دن میرے والد مرحوم نے ہمیں سیر کروانے کا پروگرام بنایا اور ہمیں

نعمت کدہ ہوٹل سے کھانا بھی کھلایا پھر ہم شالیمار باغ اور جہانگیر کے مقبرے گئے۔فیض باغ میں ہماری والدہ کے کزن احمد صاحب فوٹو گرافی کی دوکان تھی تو ہم نے وہاں سے گروپ تصاویر اتروائیں،اس دن ہم سب بھائیوں نے ایک جیسے ہی کپڑے پہنے ہوئے تھے تو ہم شالیمار باغ سیر کرر ہے تھے تو ہمارے ایک جیسے کپڑوں کی وجہ سے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

مجھے یہ واقعہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے گلبرگ میں اسلامیہ ہائی سکول سمن آباد ہیڈ ماسٹر افتخار کے یہاں فون کیا تو شاید ان کی بیٹی دوسری طرف سے بول رہی تھی تو میں اتنا گم سم ہو گیا کہ میں بول ہی نہ سکا اور اس نے جب کافی دیر تک ہیلو ہیلو کی اور کوئی جواب نہ ملا تو اس نے فون بند کر دیا۔یہ فون میں نے جناح کالونی والے گھر کی سامنے والی فیکٹری سے کیا تھا جہاں ملٹری کیلئے ٹینپیک سبزیاں وغیرہ تیار ہوتی تھیں۔

گلوب ماڈل سکول تفریح دورہ

شالا مار باغ مجھے یاد ہے وہاں ایک سیاہ فام غیر ملکی جوڑا تھا اور طالبات میں سے ایک سینئر کلاس کی طلباء نے ان سے انگلش بولی کیونکہ وہ لندن سے پڑھ کر آئی ہوئی تھی۔جب ہم ایئر پورٹ پہنچے تو سب نے جہاز دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر ناہید شباب بس میں بیٹھی رہی اور کہا کہ وہ جہاز میں کئی مرتبہ سفر کر چکی ہے۔بہر حال ہم سب نے بہت دلچسپی سے جہاز کا اندرونی حصہ دیکھا اور ہم شام کو واپس لوٹے۔گلوب سکول کے پرنسپل ایک ریٹائر میجر تھے اور اس زمانے میں مشہور ٹی وی اینکر طارق عزیز ہمارے ہمسائے تھے،شاید کرایہ پر۔ہمارے سکول کے سامنے ایک چلڈرن پارک تھا جو اب بھی ہے جہاں ہم کھیلتے تھے۔ایک مرتبہ میرے والد صاحب نے مجھے Pan Am کے کیلنڈر دیئے جو میں نے سب سکول میں تقسیم کر دیئے اور تمام اساتذہ نے انہیں بہت پسند کیا۔

اسی سکول گلوب میں میرا ایک کلاس فیلو آصف مرزا پڑھتا تھا اس کی ہمشیرہ جو میرے چھوٹے بھائی وسیم کی کلاس فیلو تھی۔ایک مرتبہ وہ میرے پاس میرے چھوٹے بھائی وسیم کی شکایت لے کر آیا کہ وسیم اس کو محبت نامہ تحریر کرتا ہے۔میرے لئے یہ بات حیران کن تھی۔ایک روز ہم سکول سے پیدل گھر جارہے تھے کہ راستے میں راجہ فوٹو سٹوڈیوز کے قریب ایک گاڑی رکی جس میں میرے والد مرحوم براجمان تھے اس گاڑی کا رنگ ہلکا آسمانی تھا اور میرے والد صاحب نے اگر مجھے صحیح یاد ہے اس زمانے میں 18 ہزار روپے کی خریدی تھی۔ہم سب بھائی بہن اس میں خوشی اور حیرت کے ساتھ بیٹھ گئے۔وہ دن

ہم سب کیلئے بہت خوشی کا دن تھا۔یوں ہم سکول گاڑی میں آنے جانے لگے گلوب سکول پانچویں جماعت تک لڑکوں کیلئے تھا۔

اسلامیہ ہائی سکول سمن آباد1975

گلوب ماڈل ہائی سکول سمن آباد کے بعدمیں نے چھٹی جماعت میں اسلامیہ ہائی سکول جسٹس کالونی میں داخلہ لیا۔اسلامیہ ہائی سکول کے پرنسپل افتخار صاحب نے جن کا خدوخال چینی لوگوں جیسا تھا لیکن وہ ایک شفیق انسان تھے۔گلوب سکول سے تین میرے کلاس فیلوز عزیزالرحمن اورعرفان اقبال وارثی میرے ساتھ اس سکول میں داخل ہوئے۔میں کلاس میں بہت شرارتی تھا۔

داخلہ گورنمنٹ کالج

میٹرک میں ہمارے سکول کے طلباء کا امتحانی مرکز سلمانیہ ہائی سکول نزد مسجد اقصیٰ سنٹر بنا اور اس امتحان میں کافی چیٹنگ یعنی نقل ہوئی اور ندیم میرے بڑے بھائی نے اس چیٹنگ میں میری مدد کی۔یوں میں سکول میں عرفان اقبال وارثی کے بعد سب سے زیادہ نمبر یعنی 627 لے کر دوسرے نمبر پر رہا میٹرک کے بعد میں نے صرف گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ کے لئے اپلائی کیا حالانکہ اس کالج کا میرٹ سب سے زیادہ ہے۔میرا نام لیٹر آن لسٹ میں آیا اور یوں مجھے پاکستان کے مشہور تعلیمی ادارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔میری زندگی کا یہ سب سے زیادہ خوشی کا دن تھااوراس زمانے میں مجیب الرحمن گلوکار کی یہ غزل بہت مشہور تھی۔

تعبیر ہے جس کی حسرتوں وغم اے ہم نسبو وہ خواب ہیں غم

ڈھونڈوں کے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یعنی کالج میں داخلے کے بعد میری کیفیت دوسرے مصرے کی ترجمان تھی لیکن بعد میں زندگی پہلے مصرے کی طرح ثابت ہوئی۔

ایک مرتبہ میں کالج سے لیٹ ہو رہا تھا تو میرا بڑا بھائی علیم جو کہ واقعی بانکا تھا۔کڑھائی والا کرتا،تہہ بند اور کھُسہ پہنے سر پر مفلر لئے اور کش لگاتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تم کالج سے لیٹ ہو رہے ہو تو میں نے اسے کہا ہاں ایسا ہی ہے تو کہنے لگا۔میں تمہیں ابھی کالج چھوڑ آتا ہوں میں نے کہا یار اپنا لباس تو بدلو تو کہنے لگا یار ہوسکتا ہے یہ لباس بھی کسی کا آئیڈیل ہو۔ہمارے گھر 6 جناح کالونی بوجہ کاروباری حالات میں تنزلی قرآن پاک کا ختم کروایا گیا جس میں میری خالہ دلشاد کے

اہل خانہ نے ثواب دارین حاصل کرنے کیلئے شرکت کی تو میری خالہ کے بیٹوں اعظم، قاسم اور عابد کی آواز سریلی تھی تو قرآن پاک کے اختتام پر عابد سے کہا گیا کہ وہ کوئی نعت باحضور سرور کائناتؐ پیش کرے تو وہ بڑا ہیروانہ انداز میں کھڑا ہوا اور کمر کو لچک دیتا ہوا گویا ہوا۔کوکوکورینا،کوکوکورینا، جو کہ اس وقت وحید مراد کی کسی فلم کا مشہور گانا تھا۔یہ سنتے ہی ہم جو کم عمر تھے انہوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں ۔جبکہ سب بزرگ خواتین وحضرات نعوذ باللہ کا ورد کرنے لگے اور اسے بزرگوں نے نیچے بیٹھا دیا۔اس طرح اس تقریب بابرکت کا اختتام ہوا۔

جناح کیپ

میں نے جب اسلامیہ ہائی سکول داخلہ پانچویں جماعت میں لیا تو اس وقت میں سکول میں اپنے والد صاحب کی جناح کیپ جو کہ انہیں چھوٹی ہوگئی تھی اس کا رنگ براؤن تھا وہ پہن کر جاتا اور مجھے سکول کے کچھ ٹیچرز کہتے کہ وہ یتیم آ گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوتا حالانکہ میں تو قومی تشخص کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔چھٹی جماعت سے میٹرک تک میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت پڑھتا اور اہل محلہ کو تبلیغ بھی کرتا کہ نماز پڑھا کرو اور اس میں مجھے بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ میرے گھر میں بھی میری سخت مخالفت تھی ۔اپنے عزیزوں واقارب کو کہتا کہ نماز پڑھا کرو اور خواتین کو پردہ کی سخت تلقین کرتا تو سب مجھے کہتے کہ وہ مولوی آ گیا۔فجر کی اذان سے پہلے اٹھ کر اندھیرے میں دوستوں کو نماز کے لئے اٹھاتا جن میں اکبر سوری، اس وقت کی مشہور اداکارہ ارم کا بیٹا ککو، ٹیپو اور دیگر دوست تھے۔ٹیپو اور ککو کے گھر والے میرے سے سخت نالاں تھے کہ یہ صبح صبح ہمیں بیزار کرتا ہے اور ایک مرتبہ ٹیپو کی والدہ نے مجھے بہت سنائیں اور میں احترام میں کھڑا جناح کیپ پہنے اور کندھوں پر کڑھائی والا رومال لئے ان کی باتیں صبر سے سنتا رہا۔ مجھے انہیں تبلیغی خدمات کے سلسلے میں مولانا آزاد امام بادشاہی مسجد نے چار کتب چاروں خلفاء راشدین کی زندگی پر مبنی دیں اور میں انہیں حاصل کر کے بہت خوش ہوا۔وہ چاروں کتب اب تک میرے پاس ہیں ۔نویں جماعت تک مذہبی رہا اور آہستہ آہستہ یہ قصہ پارینہ بن گیا۔

ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب ہمیں قرآن پاک پڑھانے ہمارے گھر واقع 6-جناح کالونی آتے تھے تو ان دنوں ہماری فیکٹری میں دو بھینسیں تھیں ۔وہ آتے ہی پوچھتے کہ لسی ہے تو ہم انہیں لسی پیش کرتے ۔ مجھے یاد ہے وہ سفید رنگ کی پگڑی باندھتے اور ان کی داڑھی سرخ مہندی لگانے کی وجہ سے سرخ ہوگئی تھی ۔ایک مرتبہ ہم نے شرارتاً ایسی کرسی مولوی صاحب کے بیٹھنے کے لیے رکھ دی جس

کا پیندہ نہیں تھا اور ہم بھائیوں میں سے ایک بھائی نے ان کی پگڑی کے ساتھ ڈور باندھ دی اور جب مولوی صاحب کرسی پر بیٹھے تو پیندہ نہ ہونے کی وجہ سے دھڑام سے نیچے کولہوں سمیت کرسی میں پھنس گئے۔ وہ سخت ناراض ہوئے اور دوبارہ ہمارے گھر نہ آئے۔

سمن آباد کرکٹ کلب

راقم اور اس کا چھوٹا بھائی وسیم سمن آباد کرکٹ کلب کے باقاعدہ ممبر تھے اور ہم دونوں بھائیوں کو لوگ جوڑی کہتے تھے کیونکہ ہم اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم دونوں سردی ہو یا گرمی، پیدل گھر سے کرکٹ پریکٹس کرنے سمن آباد جاتے۔ ہمارے دوستوں میں کپتان آصف قدوس، حسنین، قمر، سلمان، اظہر، پومی، خاور، حافظ، اصغر علی، منور، خورشید اور انجم وغیرہ تھے ہم نے بہت سے میچ کھیلے لیکن سب سے یادگار میچ سمن آباد ڈونگی گراؤنڈ میں ہوا جس میں ہم نے P&T جو کہ اس وقت کی ناقابل شکست ٹیم تھی ان کو شکست دی۔ اس ٹیم میں اس وقت کے بہت مشہور کرکٹر سعادت علی اور اشرف بھائی بھی شامل تھے اس میچ کو جیتنے کے بعد ہماری سمن آباد کرکٹ ٹیم بہت مشہور ہوگئی۔ اس کے علاوہ ایک اور میچ جو کہ نقی شمسی ٹورنامنٹ کا سیمی فائنل تھا اور یادگار اس لئے کہ یہ قذافی سٹیڈیم میں کھیلا گیا۔ میں اس میچ میں جلد آؤٹ ہو گیا کیونکہ میں آؤٹ آف پریکٹس تھا اور سوات سے ایک دن ہوئے آیا تھا۔ اس میچ میں میرے چھوٹے بھائی وسیم نے بہت عمدہ بیٹنگ کی اور 65 کے قریب سکور کیا۔ اس کے باوجود وہ میچ ہار گئے۔

مجھے اس بات کا آج بھی دکھ ہے کہ میں اس زبردست گراؤنڈ میں اچھا سکور نہ کر سکا ہمارے کلب میں وسیم چھوٹا بھائی کی زبردست ایوریج تھی اور سارے بوجہ سست بیٹنگ پا ٹک ٹک کہتے تھے۔ وسیم کا آئیڈیل کھلاڑی سنیل گواسکر تھا۔ اگر وہ سیاست میں نہ پڑتا تو مجھے یقین تھا وہ ضرور ٹیسٹ کرکٹر ہوتا۔

گورنمنٹ کالج کرکٹ ٹیم

گورنمنٹ کالج میں میرا تعلیمی معیار پست تھا کیونکہ میری زیادہ دلچسپی کرکٹ میں تھی اور ہمارے کرکٹ کے کوچ آغا سعادت نے میرے کان میں یہ بات ٹرائل والے دن ڈال دی کہ انجینئر زتو پاکستان میں ہزاروں بنتے ہیں لیکن کرکٹر کوئی کوئی بنتا ہے اس لئے تم لفٹ ہینڈ چائنہ مین کرتے ہو تو کرکٹ کھیلو تمہارے لیے چانس ہے کہ تم فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل سکتے ہو۔ سو میں کلاسز کم اور کرکٹ کی

طرف زیادہ توجہ دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری تعلیمی حالت بہت کمزور رہی۔

میرے گورنمنٹ کالج کلاس فیلوز میں نعیم بھورا، اسد میر، حافظ ناصر، سید جنید غزنوی وغیرہ تھے۔ مجھے ایک مرتبہ ہمارے فزکس کے پروفیسر خورشید نے کہا کہ تم بہت ارریگولر ہو تو میں سمجھا کہہ رہے ہیں کہ میں ریگولر ہوں تو میں نے حیرانی سے ان کا شکریہ ادا کیا تو ساری کلاس ہنس پڑی۔ اسد میر اور نعیم بھورا قد میں میرے سے بڑے تھے اور مجھے اکثر چھیڑتے تھے اور انہیں اپنی جسمانی صحت پر بھی بہت گھمنڈ تھا تو دونوں نے مجھے ایک مرتبہ کلاس میں جو کہ سیڑھیوں کی طرح ڈیسکس پر مشتمل تھی۔ مجھے اوپر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا اور میرا خوب مذاق اڑایا۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا اور کلاس کے بعد میں نے نعیم بھورے کو جائے خاص پر کک لگائی تو وہ بے ہوش ہو کر گرنے لگا اور میں یہ دیکھ کر وہاں سے دوڑ لگا گیا۔ اسی روز میں اپنے دوست محمود بھٹی اور بھائیوں کو اسد میر کے گھر لے گیا تا کہ کالج کی بے عزتی کا بدلہ چکا سکوں مگر وہ گھر نہ ملا۔ اس طرح بعد میں دونوں کلاس میں میرا مذاق نہیں اڑاتے تھے اور ہم اچھے دوست بن گئے۔ اسد چونکہ بہت اچھا اتھلیٹ تھا اور نعیم بھورا بہترین کرکٹر تو ان دونوں کے بارے میں ٹیچرز کا خیال تھا کہ بمشکل انٹرمیڈیٹ یعنی F.Sc کا امتحان پاس کریں گے مگر آج وہ اپنی فیلڈ کے بہترین ڈاکٹر ہیں۔

انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ میں ہم یعنی گورنمنٹ کالج فائنل میں ایم اے او کالج سے ہار گئے جو کہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ جس لڑکے نے ایم اے او کالج کی طرف سے سب سے زیادہ سکور بنائے تھے وہ کالج کا باقاعدہ طالب علم نہیں یوں ہم نے بورڈ میں شکایت کی اور تحقیق ہونے پر ثابت ہوا کہ وہ واقعی کالج کا سٹوڈنٹ نہیں تو ہماری ٹیم اس بنیاد پر فائنل ہار کر بھی جیت گئی اس طرح گورنمنٹ کالج اپنی روایت برقرار رکھ سکا۔

ماڈل ٹاؤن گراؤنڈ میں پہلی کرکٹ سنچری زندگی کی آخری سنچری تھی۔ ماڈل ٹاؤن سی بلاک میں ایک مستطیل گراؤنڈ تھے جو کہ لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم۔ کرکٹ گراؤنڈ کے بعد ساتھ کی فٹ بال کی گراؤنڈ بھی تھی۔ ہمارا میچ ماڈل ٹاؤن کلب اور سمن آباد کلب کے درمیان تھا۔ اظہر علی اور میں نے اوپننگ کی اور ہم دونوں نے سنچریاں بنائیں اور ہم نے ماڈل ٹاؤن کرکٹ کلب کو بری طرح ہرا دیا۔ اس میچ میں، میں نے زندگی کا پہلا چھکا بھی لگایا۔

ہماری سمن آباد کرکٹ کلب نے ایک مرتبہ گجرات اور راولپنڈی کا دورہ کیا جہاں ہم نے بہت

میچ کھیلے۔ پہلے ہماری ٹیم گجرات گئی جہاں ہم زمیندارہ کالج میں ٹھہرے وہاں کرکٹ گراؤنڈ کھیتوں کے درمیان تھی اور ہم نے وہاں میچ کا بہت انجوائے کیا میرے خیال سے ہم یہ میچ جیت گئے۔ ہمارے اس ٹور کا انتظام شفیق سینئر نے کیا تھا۔ وہاں ہم رات ایک ہی بڑے ہال میں سوئے اور سلمان درمیانہ کو میں نے رات ساری سونے نہ دیا اور اور ہم شرارتوں میں مصروف رہے۔ ہمارا راولپنڈی کا دورہ زیادہ یادگار تھا۔ ہمارے قیام کا انتظام رتہ امرال کیا گیا جو کہ راولپنڈی کا پرانے شہروں میں سے تھا۔ یہ دومنزلہ مکان تھا اور اوپر والی دوسری منزل میں کھڑے ایک مرتبہ عمر فاروق ٹیکسلا میں رات کے وقت وہاں آیا تو ہم سب سو رہے تھے اس نے ہمیں ڈرایا اور ہم واقعی ڈر گئے کہ اتنی دیر گئے تک کوٹھے پر کون ہوسکتا ہے۔ ہم نے وہاں تین چار میچ کھیلے اور جیتے۔ ہم نے ایک میچ گارڈن کالج کے خلاف موجودہ راولپنڈی سٹیڈیم کھیلا اور اسے بھی جیت لیا۔ ہم جب رتہ امرال کھانے کے لئے جاتے اور ہوٹل والے سے پوچھتے کیا پکا ہے؟ تو وہ ہمیں گالیاں دیتے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا "کیہہ پکا اے" راولپنڈی میں گالی ہے ایک اور واقعہ کہ سلیمان درمیانہ جس کا نام ہم نے درمیانہ اس لئے رکھا ہوا تھا کہ وہ ہمارا مِڈل آڈر کھلاڑی تھا جب وہ سویا ہوا تھا تو ہم نے یعنی حسنین، وسیم اور میں نے اس کے منہ پر ایک طرف کالی پالش اور دوسری طرف براؤن پالش مل دی تو صبح ہم ایک حمام میں نہانے جاتے تھے جو کافی فاصلے پر تھا تو راستے میں لوگ اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے

سلمان درمیانہ انہیں ہنستا دیکھ کر برا بھلا کہہ رہا تھا۔ جب ہم حمام میں پہنچے تو درمیانے نے اپنا منہ دیکھا تو شیشہ دیکھتے ہی رونا شروع کردیا کہ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی ہے۔ ہم نے اسے خوب چیت رسید کیں کہ سارے راستے تو تمہیں جلن نہیں ہوئی اور اب ہو رہی ہے۔ سلمان درمیانے کو گپیں مارنے کی بہت عادت تھی اس نے ہمیں بتایا کہ ایک مرتبہ برسات کے موسم میں اس کے والد نے اسے کہا کہ کھنڈویے اکٹھے کروان سے دوائی بنانی ہے تو کہنے لگا میں نے ایک کھنڈویا پکڑا جس کا منہ زمین کے اندر تھا تو میں اسے کھینچتا جاؤں تو وہ ختم ہی نہ ہو۔ چیت رسید کرتے تو وہ راہ راست آتا اسی طرح اس نے ایک گپ سنائی کہ ان کے گھر ایک کتا تھا جس کے کان گز گز لمبے تھے۔

گورنمنٹ کالج کے ہمراہ دورۂ سوات

گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر خورشید اور عظمت صاحب نے پروگرام بنایا کہ ہم ایک ہفتے کے لیے سوات تفریحی دورے پر جائیں گے۔ جس میں میرا ہم نام مبین، رؤف اور سلیم بلو شامل

تھے اور 100 روپے پر ہیڈ دے کر سوات کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچنے پر پروگرام بنا کر ہم سینما میں فلم دیکھیں گے۔اس کے لئے پیسے درکار تھے جو میرے پاس کم تھے اور میں نے بہانہ بنایا کہ میری طبیعت خراب ہے اور سب فلم دیکھنے چلے گئے۔ میں ہوٹل میں لیٹا اپنی کم حیثیت پر افسوس کرتا رہا۔ پروفیسر خورشید بہت دلچسپ انسان تھے اور وہ شرطیں بہت لگاتے۔ایک مرتبہ انہوں نے شرط لگائی کہ جو پہاڑی بکری پکڑے گا اسے پچاس روپیہ انعام دیا جائے گا۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور میں نے تہیہ کرلیا کہ میں ضرور بکری پکڑوں گا تو پہلے تو اس کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن وہ باریک ٹانگوں سے کود کر بہت تیز دوڑتی۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ میں اسے نہیں پکڑسکوں مگر پھر مجھے ایک ترکیب آئی اور میں نے پہاڑوں کے اوپر والی پگڈنڈی پر چڑھا اور بکری نیچے پگڈنڈی پر گھاس کھا رہی تھی تو میں نے اوپر سے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے پکڑ لیا یوں میں نے پروفیسر سے پچاس روپے جیت لئے اور میرے کچھ دن اچھے گزر گئے۔اس زمانے میں پچاس روپے کھانے پینے کے لئے کافی تھے۔ پروفیسر خورشید نے اس کے بعد ایک اور شرط لگائی کہ جو بھی لڑکا دریائے سوات میں زیادہ دیر تک پانی میں پاؤں ڈبوئے رکھے گا اس کو بھی پچاس روپے انعام دیا جائے گا ہم سب نے پاؤں پانی میں ڈبو دیئے اور یخ بستہ پانی پاؤں کے راستہ دماغ تک اپنی ٹھنڈ پہنچانے لگا تو ہم بڑے پتھروں پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے اس شرط کو رؤف لڑکا جیتا۔ جب ہم سوات کی آخری حد اتروڑ پہنچے تو پروفیسر خورشید نے پھر یہ شرط لگادی کہ جو بھی پہاڑ سے برف اٹھا کر لائے گا اسے سو روپیہ انعام ملے گا تو اس میں میرا ہمنام، مبین، رؤف وغیرہ شامل ہوئے۔ وہ صبح دس بجے کے گئے اور یہ جب عصر تک وہ واپس نہ آئے تو ہمیں تشویش ہوئی اور ہم نے مقامی لوگوں کی خدمات لیں اور انہیں کہا کہ ہمارے ساتھیوں کو ڈھونڈو اور ہم نے انہیں پیسے بھی دیئے۔عصمت صاحب جو بہت مذہبی بلکہ جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا انہوں نے کہا چلو مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ مسجد میں یخ پانی تھا اور جب وضو کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ سن ہو گئے۔خدا خدا کر کے وضو کیا جب مسجد میں داخل ہوئے تو مقامی لوگ چشمہ کا پانی لے کر جلتی آگ پر پانی گرم کر کے وضو کر رہے تھے۔ہم نماز پڑھ کر باہر نکلے تو رؤف اور مبین ہمارے سامنے براجمان کھڑے تھے۔

جیسے پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ میں کالج میں زیادہ دلچسپی پڑھائی کی بجائے کرکٹ میں لیتا تھا تو میری خالہ کا بیٹا اعظم محی الدین بھی میڈیکل میں پڑھتا تھا اور پڑھائی کو بہت سیریس لیتا۔آج کل وہ

اپنی محنت کی بدولت ڈاکٹر ہے اُس نے اچھی آواز پائی تھی اور کالج میں اس زمانے کی مشہور غزل "انشا جی اٹھواب کوچ کرو" گائی اور بہت مشہور ہو گیا اور اعظم کا نام انشا جی کالج میں پڑ گیا۔

گورنمنٹ کالج کی گراؤنڈ اوول میں سالانہ کھیل تھے جس میں، میں نے بھی شرکت کی اور دوڑ میں آخر میں دوسرے نمبر پر آیا۔ آخر نمبر پر کون آیا تھا مجھے نہیں معلوم اگرچہ میں نے کالج میں این سی سی بھی جوائن کی مگر پریڈ کمانڈر میری کارکردگی سے سخت ناراض تھا اور مجھے کہتا کہ تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ این سی سی جوائن کرو کیونکہ اس وقت این سی سی جوائن کرنے پر 20 اضافی نمبر ملتے تھے۔ اپنی کارکردگی اور پریڈ کمانڈر کے رویہ کی وجہ سے میں نے این سی سی چھوڑ دی۔

گریجویشن 1981

راقم کا داخلہ اسلامیہ کالج سے نہ جا سکا جس کی وجہ سے بی اے میں مجھے بحیثیت پرائیویٹ امیدوار شامل ہونا پڑا۔ میرا امتحان مرکز دیال سنگھ کالج بنا جو کہ میں نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ میرے بی اے کے امتحان شروع ہونے سے پہلے ہی ہمارے گھر واقعہ بسطامی روڈ پر پولیس بوجہ مارشل لاء بہت چھاپے پڑتے تھے۔ وجہ میرے بھائیوں کی یعنی آغا ندیم اور آغا نوید جن کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا گرفتاری کے لئے چھاپے پڑتے اور مجھے امتحان کی تیاری کے لئے مختلف جگہوں جن میں میلسی بھی شامل ہے جانا پڑا۔ یہ سیاسی عتاب 17 اگست 1987ء تک رہا جس کی تفصیل آنے والے صفحوں میں بیان کروں گا۔

1978 داخلہ اسلامیہ کالج سول لائنز اور کرکٹ

ہمارا امتحان سنٹر گورنمنٹ کالج کا اولڈ ہال بنا اور میری امتحانی تیاری واجبی سی تھی اور فزکس میں میری کمپارٹمنٹ آ گئی اور مجھے اس کو کلیئر کرنے میں کافی وقت لگا۔ ایف ایس سی بمشکل تھرڈ ڈویژن میں پاس کی اور بعد میں اپنے ماموں زاد بھائی منظر بٹ کے کہنے پر اسلامیہ کالج سول لائنز میں اس لئے داخلہ لے لیا تا کہ ہم اکٹھے کرکٹ کھیل سکیں اور میں بی ایس سی میں داخلہ ملنے کے باوجود پھر کرکٹ میں مصروف ہو گیا۔ ہمارے کرکٹ کے انچارج صفدر صاحب تھے جو منظر کے بوجہ اس کی ڈپلومیسی بہت معترف تھے اور کرکٹ کے معاملات میں اس سے مشورہ کرتے تھے۔ ہمارا انٹر یونیورسٹی فائنل گورنمنٹ کالج کے خلاف یونیورسٹی گراؤنڈ اولڈ کیمپس میں تھا۔ مجھے بطور اوپنر ٹیم میں رکھا گیا لیکن بعد میں نامعلوم وجوہات کی بناء پر اس اہم میچ میں مجھ سے اوپننگ نہ کروائی گئی اور اسی میچ میں ہمارے

کپتان ناصر چغتائی نے بولرز کا اینڈ تبدیل کروانے کے لئے مجھے باؤلنگ دی تو میرے اوور کے تیسرے بال پر اشرف بھائی جو بعد میں پاکستان کی ٹیم کا وکٹ کیپر بنا، نے گورنمنٹ کالج کے اوپنر لال دین کا وکٹ کے پیچھے کیچ چھوڑ دیا اور لال دین اس وقت کچھ رنز پر کھیل رہا تھا اور بعد میں اس نے سنچری بنائی اور ہم یہ میچ گورنمنٹ کالج سے ہار گئے اس میچ میں رمیض راجہ نے بھی حصہ لیا۔

ایک میچ میں، میں اسلامیہ کالج سول لائنز کی طرف سے کھیل رہا تھا تو ہماری پہلی باری تھی۔ لنچ کے وقت ہم ٹیم ممبرز نے پرانی انارکلی کھانے کے بعد پیڑوں والی لسی پی۔منظر بٹ کے اصرار پر دوسرے گلاس بھی پیوؤں جو میں نے اس کے اصرار پر پی اور بعد میں وکٹ کیپنگ کرنے میں مشکل پیش آئی اور مجھ سے کیچ چھوٹ گئے اور میری کارکردگی سے میرا ٹیم انچارج بہت ناراض ہوئے۔

میری ممانی عذرا ناصر جو شیخوپورہ گرلز کالج میں پرنسپل تھیں تو ہم سب مل کر ویسٹ انڈیز اور پاکستان کے میچ کی کمنٹری سن رہے تھے اور رات آدھی تھی تو ہم نے تاش کھیلنی شروع کر دی چار آنے بوٹ تو ممانی عذرا نے دیکھ لیا اور با آواز بلند کہا ''ظالموں اگر میں نہیں دیکھ رہی، خدا تو دیکھ رہا ہے''۔ تاش بند کرو تو منظر جو کہ اپنی والدہ کو بی بی جان کہتا تھا کہا کہ بی بی جان آپ نہ دیکھیں خدا کو دیکھنے دو۔

منظر ایک ٹیم شیخوپورہ سے لے کر لاہور آیا اس نے مجھے کرکٹ ٹیم میں اس لئے شامل کیا کہ میری شمولیت سے شیخوپورہ کی ٹیم مضبوط ہو جائے گی۔ یہ میچ ایف سی کالج لاہور کے خلاف تھا اور کالج کی خوبصورت گراؤنڈ میں تھا۔شیخوپورہ ٹیم کے ممبران مجھے بہت رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ میں انہیں میچ جتاؤں گا تو جب میچ شروع ہوا تو ہماری ٹیم کم سکوروں پر آؤٹ ہو گئی اور میں بمشکل بارہ سکور کر سکا جس سے شیخوپورہ والوں کو بہت مایوسی ہوئی جب ایف سی کالج والوں نے بیٹنگ شروع کی تو میں وکٹ کیپنگ کرنے لگا۔میں نے دوسرے اوور میں ایف سی کالج کے بہترین بلے باز جس کا نام بوبی تھا کا وکٹ کے پیچھے کیچ چھوڑ دیا اور اس نے ہماری ٹیم کی بڑی دھلائی کی اور میں نے بوبی کے اس میچ میں دو کیچ چھوڑے اور ہم یہ میچ بری طرح ہار گئے۔میں نے شیخوپورہ کی ٹیم کو کہتے ہوئے سنا کہ منظر، مبین کو ٹیم میں اس لئے شامل کیا تھا کہ ہمیں میچ ہراؤ۔اس طرح وہی نظریں جو مجھے پہلے رشک سے دیکھ رہی تھیں میچ کے اختتام پر غصہ سے مجھے گھور رہی تھیں اور منظر نے کہا کہ یار، تمہاری وجہ سے میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔

4اپریل ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی

4اپریل 1974ء کو جس دن بھٹو کو پھانسی ہوئی تو ہم سب گھر والوں کو بہت دکھ ہوا اور ہم سب بھائی بشمول آغا تنویر جو کہ معذور تھا سڑکوں پر نکل آئے۔ میرا چھوٹا بھائی وسیم بہت پیش پیش تھا اس نے سمن آباد موڑ سے لے کر ضلع کچہری تک بہت سے پٹرول پمپوں کو نذر آتش کیا اور مال غنیمت بھی اکٹھا کیا۔ میں دور سے اس کی یہ تمام کارروائیاں دیکھتا رہا اور پھر جب ہم گھر واپس آئے تو اس کی جیب میں سوسو کے ہزاروں نوٹ تھے چونکہ میری بڑی ہمشیرہ کی ان دنوں شادی بھی تھی تو اس نے بڑی بہن کے لئے لبرٹی بہت شاپنگ کی۔ ان ہنگاموں میں پیپلز پارٹی کے کسی بھی سرکردہ لیڈر نے حصہ نہ لیا اور صرف کارکن ہی سڑکوں پر آئے۔ غائبانہ نماز جنازہ میں سعید حسن، وکیل یا ایک دو اور نمایاں لیڈر بھی تھے۔ یہ غائبانا نماز جنازہ ناصر باغ میں ہوا۔

ضیاء مارشل لاء میں قیدو بند کی صعوبتیں

ضیاء مارشل لاء میں چھاپے، گرفتاریاں اور شاہی قلعہ عقوبت خانہ میں اذیت ناک تشدد شروع ہو گیا۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے بعد ہم سب اہلخانہ پر شدت عذاب نازل ہوا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک لڑکا تنویر زماں رہتا تھا وہ اکثر ہمارے گھر آتا اور ہم سب نے اس کی زبانی لفظپر ولتاریاں اور برثواں سنا۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ وہ ندیم کو سات لے کر لندن چلا گیا ہے۔ ندیم تین چار ماہ بعد واپس آ گیا۔ تنویر زماں بھی۔ تو ایک دن ہمارے گھر جلسہ ہو رہا تھا اور ہمارے گھر کے باہر چاروں طرف پولیس تھی اس جلسے میں پیپلز پارٹی کے لیڈران بھی شامل تھے۔ جلسہ میں حسب معمول بہت پرجوش تقاریر ہوئیں اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔ اسی روز دیر گئے رات ہمارے گھر پولیس کا چھاپہ

پڑا۔ پولیس والے آغا ندیم میرے بڑے بھائی کا پوچھ رہے تھے اوران کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ کمانڈو تربیت لے کر آیا ہے۔ ہمارے لئے یہ بات باعثِ تشویش و حیرانی تھی۔ پولیس والے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی آغا نوید کو پکڑ کر تھانہ لٹن روڈ لے گئے اور ہم سے الگ الگ آغا ندیم صاحب کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ہمیں جو کچھ معلوم تھا ہم نے بتا دیا اور اگلے دن ہم دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کے بعد پولیس کا معمول بن گیا اور وہ ہمیں اکثر پکڑ کر لے جاتی۔

میں اپنے گھر واقعہ بسطامی روڈ ایم اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ حسب معمول پولیس کا چھاپہ پڑا، انہیں مخبری ہوئی تھی کہ ہمارے گھر آغا ندیم جوان دنوں مفرور تھا آیا ہے، تو انہیں ندیم تو نہ ملا اور وہ پکڑ کر مجھے پہلے ماڈل ٹاؤن مجسٹریٹ کے پاس پیش کیا اور بعد میں مجھے لاہور کیمپ جیل میں بھیج دیا۔ وہاں پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر میاں افتخار پہلے سے بند تھے اوران کے پاس کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ان کے ساتھ بیرک میں مجھے بھی بند کر دیا۔ ان کے پاس کھانے پینے کا بھی وافر سامان تھا اور وہ اس احاطہ کے تمام حوالاتیوں کو کھانا وغیرہ کھلاتے تھے۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو درخواست دی کہ میں ایم اے کے امتحان میں شامل ہونے کے لئے رجسٹریشن کروا چکا ہوں تو مجھے جیل سے امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے تمہاری پہلے ہی رہائی ہو جائے اور یہ ہی ہوا لیکن میری پڑھائی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ رہائی کے بعد میں نے پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس امتحان دیا لیکن میری زیادہ مضامین میں کمپارٹمنٹس آ گئیں اور میں ایم اے کلیئر نہ کر سکا۔

جیسا کہ تحریر کر چکا ہوں کہ پولیس چھاپے مار کر مجھے اکثر لے جاتی تو میں نے کسٹم انسپکٹر کی ملازمت کیلئے اپلائی کر رکھی تھی۔ جس روز اس جاب کے لئے تحریری ٹیسٹ تھا اس سے ایک دن قبل سمن آباد پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی۔ بسلسلہ سیاسی کارکن تو میں نے ایس ایچ او کو بتایا کہ میں نے اگلے دن کسٹم انسپکٹر کی جاب کے لئے تحریر ٹیسٹ واقعہ کسٹم ہاؤس دینا ہے۔ اس نے ثبوت مانگا تو میں نے اسے ٹیسٹ میں شامل ہونے کی رسید دکھا دی۔ اس نے اگلے دن مجھے ہتھکڑی لگا کر دو سنتریوں کے ساتھ کسٹم ہاؤس تحریری ٹیسٹ کے لئے بھیجا۔ یہ ٹیسٹ لان میں ہو رہا تھا تو سارے امیدوار میری طرف دیکھنے لگے۔ میرے ساتھ پولیس کا ایک سنتری بیٹھ گیا اس نے بمشکل میرے ایک ہاتھ سے ہتھکڑی کھولی تا کہ میں لکھ سکوں میرے خیال سے میں نے اچھا امتحان دیا مگر اس میں تحریری ٹیسٹ کے علاوہ اور لوازمات بھی تھیں جو میں پوری نہ کر سکا اور کسٹم انسپکٹر نہ بن سکا۔ مجھے ایک امیدوار نے کہا آپ ابھی سے کسٹم

انسپکٹری کا امتحان ہتھکڑیوں میں دے رہے ہیں یہ تو آپ کو انسپکٹر بننے کے بعد لگنی چاہیے تھی۔ مجھے اس کی یہ بات اس وقت کو سمجھ میں نہ آئی لیکن اب سمجھ میں آئی ہے۔

گلشن کارپٹ انڈسٹریز

1981ء میں راقم نے بی اے پاس کرنے کے بعد گلشن کارپٹ واقع گلبرگ روڈ بحیثیت اسسٹنٹ پرچیزر ملازمت کر لی۔ میری تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ میں نے بہت محنت اور لگن سے یہ نوکری کی۔ اس کمپنی کا مالک ملک عاشق تھا جو دوبئی میں تعمیراتی کمپنی کا مالک تھا اور پاکستان میں ملتان روڈ پر واقع گلشن کارپٹ فیکٹری لگا رہا تھا۔ میرے کام سے مالکان جن میں ملک ارشد اور خورشید تھے، وہ مطمئن تھے۔ ایک دن بروز جمعرات مجھے دفتر میرے والد مرحوم کا فون آیا کہ گھر میں ضروری کام ہے تم فوراً آ جاؤ تو میں دفتر سے گھر پہنچا تو مجھے والدہ نے بتایا کہ پولیس ہمارے والد کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے۔

شاہی قلعہ منتقلی تفتیش وتشدد

مجھے تھانے میں بٹھا دیا اور پھر میرے والد مرحوم سے کہا کہ آپ جائیں ہم آپ کے بیٹے کو جلد چھوڑ دیں گے اور مجھے میرے پاؤں پر کڑا لگا دیا گیا۔ مجھے اس پر تشویش ہوئی تو کہنے لگے ابھی ایس ایچ او آ جائیں گے اور تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ کچھ دیر بعد میرے تایا زاد بھائی اسیم بٹ آیا تو میں نے کہا کہ انہوں نے مجھے کڑا لگا دیا ہے اور میرے پاس کمپنی گلشن کارپٹ کا تقریباً پانچ ہزار کیش اور راڈو گھڑی تھی جو میں نے اتار کر اسے دے دی۔ رات تھانہ میں گزاری اور اگلے دن بروز جمعۃ المبارک صبح بوقت تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مجھے ہتھکڑی باندھ کر ایک انسپکٹر کے کمرے میں پیش کیا گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ایم ایل آر کے مطابق ایف آئی آر 211 کے تحت دفعہ 302 کے علاوہ بے شمار تعزیرات کے تحت گرفتار کیا ہے۔ میں دفعہ 302 سن کر فکرمند اور بے چین ہو گیا اور میرے اہلخانہ کو بھی اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ بعدازاں مجھے لارنس روڈ واقع ملٹری کورٹ کے میجر کے روبرو پیش کیا گیا جس نے مجھے وہاں سے شاہی قلعہ منتقل کرنے کا حکم صادر کیا تا کہ میری پوری طرح تفتیش ہو سکے اور میں پولیس کے زیر حراست ایک ٹرک میں شاہی قلعہ پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر میری جامہ تلاشی لی گئی اور بعدازاں مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ شفیع کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھے ایک مختصر سے بیان میں باور کروایا کہ میں کس خطرناک اذیت خانہ میں ہوں اور مجھے سب کچھ صاف صاف بتانا ہوگا ورنہ شاہی قلعہ سے واپسی

ناممکن ہے۔

مجھے پھر سیل نمبر ایک میں بند کر دیا گیا جس کا سائز تقریباً 4x8 تھا اس میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا سیمنٹ کا جس پر میں بیٹھ گیا اسی کے اندر حاجئے ضرورت کے لئے ایک پوٹ تھا۔ میں کچھ دیر سیل کا جائزہ لینے کے بعد چبوترے پر لیٹ گیا۔ شاہی قلعہ میں روٹی تقسیم کرنے والا بھیا دوپہر کا کھانا جو کہ ساگ اور روٹی پر مشتمل تھا میرے لئے لے کر آیا اور بولا کہ کھانا کھالو مگر مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی اور میں سو گیا۔ وہ پھر شام کا کھانا لایا اور اس نے کہا کہ تم نے دوپہر کھانا ویسے ہی چھوڑا ہوا ہے تو اب شام کا ضرور کھا لینا ورنہ میں ڈپٹی شفیع کو تمہاری شکایت کر دوں گا۔ میں نے شام کا کھانا جس میں دال کم شوربہ اور روٹی تھی کھالی تقریباً آدھی روٹی کھائی اور پھر سو گیا۔ اگلے دن بھیا الصبح ناشتہ میں چائے اور چنے لے کر آیا جو میں بمشکل کھا سکا اور پھر سو گیا۔ دوپہر کو جب بھیا کھانا لے کر آیا تو مجھے کہنے لگا تم یہاں سونے کے لئے آئے ہو یہاں تو بڑے بڑوں کی نیند اڑ جاتی ہے مجھے سیل نمبر ایک میں دو دن رکھا گیا بعد میں مجھے سیل نمبر تین میں میں منتقل کر دیا گیا میری چار دن تک تفتیش نہ ہوئی اور میں حیران تھا کہ انہوں نے مجھے کس لئے گرفتار کیا ہے۔ خدا خدا کر کے پانچویں دن ساڑھے نو بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی ہاتھ میں چابیاں اور ہتھکڑی لئے ہوئے میرے سیل کے پاس آیا۔ مجھے کہا کہ میں ایک ہاتھ باہر نکالوں تو اس نے مجھے ہتھکڑی باندھ دی اور سیل کا تالا کھول کر مجھے باہر نکالا اور دوسرے ہاتھ پر بھی ہتھکڑی لگا دی اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے چلنے کو کہا۔ میرے دائیں بائیں دو پولیس والے میرے بازو پکڑ کر مجھے لے کر چلنے لگے اور تھوڑی دیر چلنے کے بعد میں سیڑھیاں ان دونوں کی مدد سے چڑھنے لگا۔ کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد تب میری انکھیں کھلیں تو میں ایک بڑے ہال میں تھا اور وہاں کسی ملزم کی چھترول ہو رہی تھی جو میرے لئے تکلیف دہ تھی۔ مجھے کچھ دیر وہاں روکے رکھا اور بعد میں ایس پی سردار کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایس پی سردار عمر ساٹھ سال سے زیادہ معلوم ہوتی تھی اور بال بالکل سفید شکل سے بہت بے رحم معلوم ہوتا تھا۔ مجھے کہنے لگا تم جانتے ہو کہ کہاں کھڑے ہو؟ میں نے کہا جی معلوم ہے تو کہنے لگا جو جو پوچھا جائے صحیح صحیح بتانا۔ پھر اس نے مجھے میرے باقاعدہ تفتیشی افسر شوکت کے حوالے کر دیا جس کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک کرسی اور ٹیبل تھی اور اس نے مجھے کہا کہ اگر تم نے صحیح صحیح سب کچھ بتا دیا تو تم کو جلد یہاں سے فارغ کر دیا جائے گا۔ پھر اس نے میرے ہاتھ میں کچھ کاغذی دستے اور بال پوائنٹ تھما دیا اور کہا کہ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات لکھنا شروع کر دو کہ کب کہاں پیدا

ہوئے اور کہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے کہنے کے مطابق میں صفحات کالے کرتا اور میرے تحریر کردہ جواب کو وہ ایس پی سردار کے پاس لے جاتا اور ایس پی پڑھنے کے بعد جو تحریری اسے سمجھ نہ آتی وہ اسے سرخ پن سے انڈر لائن کر دیتا اور مجھے بول کر اس کے بارے میں زبانی پوچھتا۔

گرفتاری یکم اپریل 1983

ایف آئی آر نمبر 211 ایم ایل او 54

شاہی قلعہ تفتیش وتشدد

سردار کے کمرے میں لے جایا گیا ایس پی سردار عمر ساٹھ سال سے زیادہ معلوم ہوتی تھی اور بال بالکل سفید شکل سے بہت بے رحم معلوم ہوتا تھا۔ مجھے کہنے لگا تم جانتے ہو کہ کہاں کھڑے ہو؟ میں نے کہا جی معلوم ہے تو کہنے لگا جو جو پوچھا جائے صحیح صحیح بتانا پھر اس نے مجھے میرے باقاعدہ تفتیشی افسر شوکت کے حوالے کر دیا جس نے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک کرسی اور ٹیبل تھی اور اس نے مجھے کہا کہ اگر تم نے صحیح صحیح کچھ بتا دیا تو تم کو جلد یہاں سے فارغ کر دیا جائے گا پھر اس نے میرے ہاتھ میں کچھ کاغذی دستے اور بال پوائنٹ تھما دیا اور کہا کہ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات لکھنا شروع کر دو کہ کب کہاں پیدا ہوئے اور کہاں تعلیم حاصل کی۔ اسن کے کہنے کے مطابق میں صفحات کالے کرتا اور میرے تحریر کردہ جواب کو وہ ایس پی سردار کے پاس لے جاتا اور ایس پی پڑھنے کے بعد جو تحریری اسے سمجھ نہ آئی وہ اس سرخ پن سے انڈر لائن کر دیتا اور مجھے بول کر اس کے بارے میں زبانی پوچھتا۔

ایس پی سردار نے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے دو بھائی آغا ندیم اور آغا وسیم اس وقت کابل ہیں مگر یہ بتاؤ کہ ولید کہاں ہے؟ درحقیقت ولید میری گرفتاری سے دو دن پہلے ہمارے گھر اِندر نگر آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی کمانڈوز تربیت لے کر کابل سے پاکستان آیا ہے۔ ہم سب گھر والوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کیونکہ ولید بچپن سے ہی بہت کمزور دل واقعہ ہوا تھا اور وہ خون دیکھ کر بے ہوش جاتا تھا۔ اس تبدیلی کو ہم نے بڑی حیرت سے قبول کیا۔

میں نے سوچا کہ اگر میں ولید کے بارے میں صحیح بتا دیتا ہوں تو وہ پکڑا جائے گا اور اس وقت

کے قانون کے مطابق اسے سزائے موت ہو جائے گی۔ میں نے ایس پی سردار کو بتایا کہ وہ اپنے دوست شیخ نسیم کے ساتھ فلپائن میں فلاں ہوٹل اور کمرہ نمبر فلاں میں مقیم ہے تو انہوں نے شاید میری اس بات پر یقین کر لیا۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کپتان کون ہے؟ میں نے پوچھا پاکستان کرکٹ ٹیم کا؟ انہوں نے کہا کہ کسی کپتان کو جانتے ہو جو ندیم وغیرہ کا دوست ہے تو میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

آغا ولید کی گرفتاری، رہائی اور مجھ پر بہیمانہ تشدد

اس پوچھ گچھ کے چند دنوں بعد میں نے دیکھا کہ آغا ندیم اور آغا ولید کا دوست حسنین نامی قلعہ میں ہے تو مجھے بڑی حیرانگی ہوئی اور شک ہوا کہ ندیم اور ولید بھی تو گرفتار نہیں ہو گئے۔ اگلے دن مجھے تفتیش کے لئے اوپر لے جایا گیا اور مجھے شوکت نے ایک اخبار کا تراشہ دکھایا جس میں ولید اور حسنین کی گرفتاری کی خبر بمع تصاویر چھپی ہوئی تھی کہ وہ منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ شوکت نے کہا کہ اسے ولید کو پہچانتے ہو اخبار میں ولید کا نام وحید لکھا ہوا تھا میں نے کہا ہاں یہ میرا بھائی ولید ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ ہمارے پاس بند ہے اور ابھی اس سے تمہاری ملاقات کرواتے ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گھیرا ڈال لیا اور مجھے چاروں طرف سے چھتر، لاتیں اور ڈنڈے مارنے لگے۔ میں شدت درد سے چلا رہا تھا مگر وہ مجھے دیوانہ وار مارتے رہے اور کہتے رہے ولید فلپائن میں ہے تم نے یہ ہی بتایا تھا نا۔ کافی دیر تک یہ تشدد برقرار رہا اور مجھے ایس پی سردار کے پاس پیش کیا گیا اس نے کہا یہ کریمنل ہے اور کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ بیڑیاں پہنا دو اور اس دن کے بعد میری روزانہ تفتیش ہونے لگی اور مجھ پر بہیمانہ تشدد شروع ہو گیا۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اگر ولید پکڑا گیا ہے تو انہیں مجھ پر اتنا تشدد تو نہیں کرنا چاہئے۔ ایک دن میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ مجھے ولید سے ملوا تو دو۔ تو انہوں نے کہا کہ ضرور ملوائیں گے لیکن بعد میں پتہ چلا ولید گرفتار ضرور ہوا تھا مگر وہ ایک ہفتہ پولیس کی حراست میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہا ہو کر نکل گیا تھا اور جس روز مجھے شاہی قلعہ سمری ملٹری کورٹ سے بھیجا گیا اسی دن ولید بھی گرفتار ہوا، لیکن وہ ایک ہفتہ پولیس کے پاس رہنے کے باوجود نکل گیا اور یہ بات جب میرے تفتیشی افسران کو پتہ چلی تو انہوں نے مجھے جھل دینے پر بہت مارا، لیکن میں مطمئن اس بات پر تھا کہ ولید کی جان بچ گئی۔

شاہی قلعہ میں قید کے دوران کچھ الذوالفقار کے کمانڈوز پکڑے گئے تو میری تفتیش کے دوران ایک کمانڈو اعظم بٹ کو میرے سامنے لایا گیا اور اس سے پوچھا اسے جانتے ہو، حالانکہ میں نے

اپنے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اعظم بٹ نے کہا ہاں یہ اکبر ہے اور ہم دونوں کابل میں اکٹھے کمانڈو ٹریننگ کرتے تھے۔ اکبر میرے بڑے بھائی آغا ندیم کا کوڈ نام تھا اور اس کی مجھ سے بہت شکل ملتی ہے اور میری والدہ بھی دھوکہ کھا جاتی تھیں تو میں اعظم بٹ کی جھوٹی گواہی پہ بہت پریشان ہوا حالانکہ میں کبھی بھی کابل نہیں گیا تھا لیکن تفتیشی افسران یہ کہنے لگے کہ مبین بڑا پکا کمانڈو ہے اور ایک بندہ گواہی دے رہا ہے۔ یہ نہیں مان رہا اور مجھے پھر بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں یقین ہو گیا کہ میں اکبر نہیں ہوں اور جس وقت میرے کابل ہونے کی یہ بات کر رہا ہے تھا میں گلشن کارپٹ میں کام کرتا تھا۔

میرا سب سے بڑا بھائی آغا تنویر جو معذور تھا تقریباً سات ماہ تک شاہی قلعہ میں برائے تفتیش بند رہا تو ایک مرتبہ اسے لینے کے لئے دو تفتیشی افسران اس سے پوچھ گچھ کے لئے لینے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے یار اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ میں نے تنویر کو بہت ماہ بعد دیکھا تو اس کا چہرہ گھنی داڑھی میں چھپا ہوا تھا اور اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

میری شاہی قلعہ میں خودکشی کی کوشش

سیل نمبر تین میں کچھ دن رہنے کے بعد میں بہت ڈیپرس ہو گیا اور میں نے بھرپور کوشش کی کہ میں خودکشی کرلوں اور میں نے اپنے آزار بند سے کئی مرتبہ گلا گھوٹنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا اور کوئی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔

جب میں خودکشی کرنے میں ناکام رہا اور اگلے دن مجھے ایس پی سردار کے پاس پیش کیا گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ گردن کے اردگرد نشان کیسے ہیں تو میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ مجھے تفتیشی افسران نے مارا ہے تو اس نے انسپکٹر شوکت کو بول کر سخت تنبیہ کی کہ آئندہ ایسے مت مارنا لیکن میرے خیال میں وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔

جب تفتیشی افسران کو اندازہ ہو گیا کہ میری تفتیش تقریباً مکمل ہو گئی ہے تو انہوں نے میرے سیل میں ایک بزرگ تاج دین پنڈت اور نوید کو میرے سیل میں بند کر دیا۔ اس طرح ہمارا وقت اچھا گزر جاتا۔ تاج دین پنڈت مناواں کا رہنے والا تھا جس کی افواج پاکستان کے لئے بہت خدمات تھیں مگر اس نے جاوید اختر کو انڈیا بارڈر کراس کروایا تھا جس کے جرم میں وہ پکڑ گیا۔

جب تفتیشی افسران کو اندازہ ہو گیا کہ میری تفتیش تقریباً مکمل ہو گئی ہے تو انہوں نے مجھے یاد

ہے ایک مرتبہ گارڈ نے کہا کہ بروز جمعہ تمہیں ناشتہ میں حلوہ پوڑی اور چھجے کے پائے کھانے کوملیں گے تو میں بہت خوش ہوااور بروز جمعہ جب بھیاوہی چائے اور چنے لے کرآیا تو میں نے اس سے استفسار کیا کہ حلوہ پوڑی اور پائے کہاں ہیں تو وہ کہنے لگا تم کون سے اچھے کام کر کے آئے تو جو تمہیں حلوہ پوڑی اور پائے ملیں۔ یوں سنتری کا مذاق میرے لئے ندامت کا باعث بنا۔

ڈپٹی شفیع کے آفس میں والدہ اور بڑی ہمشیرہ سے ملاقات

جب میری انکوائری کافی حد تک مکمل ہوگئی تو مجھے سیل نمبر 14 جو کہ اوپر والی منزل پر ایک بڑا حال تھا وہاں منتقل کر دیا گیا وہاں میر عمر فاروق، رفیق کاموںکی والا اور ڈسکہ کا انسپکٹر ریٹائرڈ سلیم کا والد بھی تھا۔ رفیق کاموںکی والے کو ڈاکٹر نے گلوکوز لگا رکھا تھا تو جب وہ سوجاتا تو عمر فاروق اور رفیق چپکے چپکے اس کا گلوکوز کھا جاتے اور وہ صبح اٹھ کر شکایت کرتا کہ میرا گلوکوز کون کھا تا ہے۔ میں اسی سیل یعنی 14 میں بند تھا تو ڈپٹی شفیع ہمارے سیل میں آیا اور مجھے کہا کہ تیار ہو جاؤ سب یہ سمجھے کہ میری رہائی ہے تو میں تیار ہو گیا جب میں نیچے اتر رہا تو سنتری نے بتایا کہ میری ملاقات آئی ہے اور تم نے کوئی غیر ضروری بات کی تو تمہیں مار پڑے گی۔ میں جب ڈپٹی شفیع کے کمرے میں پہنچا تو کچھ دیر بعد امی جان، باجی ملیحہ اور احسن سے میری ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے جنہیں میں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر چہ میں نے یہ جرم نہیں کیا لیکن میری گرفت ضرور کسی گناہ کا نتیجہ ہے۔ مجھے امی جان نے بتایا کہ میں تمہارے لئے کھانا لائی تھی مگر جیل حکام نے نہیں آنے دیا بہر حال انہوں نے مجھے پیسٹ، صابن اور کچھ بسکٹ کے ڈبے دیئے اور میں لے کر سیل نمبر 14 میں آ گیا اور سب مجھ سے ملاقات کی تفصیل پوچھنے لگے۔

محمود بھٹی فیشن ڈیزائنر

نوجوانی کا ہی ایک واقعہ ہے کہ میں میچ کھیلنے سمن آباد ڈونگی گراؤنڈ جا رہا تھا کہ راستے میں میری ملاقات دو کاندار سے ہوگئی جو سائیکلیں کرایہ پر دیتے تھے۔ یہ دو بھائی تھے انہوں نے مجھے کہا کہ آپ سائیکل کرایہ پر لے کر گئے تھے مگر آپ نے سائیکل خراب کر کے واپس کی ہے۔اس کے پیسے دو میں نے اسے کہا کہ اتنے دن بعد بات کر رہے ہو مجھے جانے دو۔اس پر انہوں نے میرا بیٹ چھیننے کی کوشش کی جو میں نے انہیں نہیں دیا۔تو انہوں نے مجھے ہوا بھرنے والا پمپ مارا اور میری کمر سے خون بہنے لگا۔ میں روتا ہوا گھر واپس آیا اور اپنے بھائیوں کو لے کر دو کاندار کے پاس پہنچا۔ محمود بھٹی کو یہ معلوم

ہوا تو اس نے گھر سے پستول لیا اور دوکاندار بھائیوں کو دھمکانے کے لئے بسطامی روڈ جہاں ان کی دوکان واقعہ تھی دوڑتا ہوا آیا مگر وہ دونوں بھائی پستول دیکھ کر اور مشتعل ہو گئے اور محمود سے پستول چھیننے لگے اور ہمیں لینے کے دینے پڑ گئے اور بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ میں زخمی حالت میں بھی میچ کھیلتا رہا اگرچہ دوران میچ میری کمر سے خون رستا رہا۔ محمود بھٹی باقاعدہ بلیک ایگل کا ممبر تھا۔

محمود بھٹی سے منسلک ایک اور واقعہ یوں ہے کہ ہمارے دونوں کے گھر کے قریب بسطامی روڈ پر ایک مسجد تھی جو اب بہترین حالت میں ہے لیکن اس وقت مسجد کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی اور ہم دونوں نماز سے قبل مسجد چلے جاتے تھے اور اس کی صفائی کرتے اور ہینڈ پمپ سے پانی کی ٹینکی بھرتے تا کہ نمازیوں کو وضو میں پریشانی نہ ہو تو محمود ایک مرتبہ مسجد آیا تو اس کی انگلی زخمی تھی اور اس میں جھاڑو کا ایک موٹا تیلا گھسا ہوا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا میں نے اسے کہا کہ لاؤ میں یہ تیلا نکال دوں۔ مگر وہ کہنے لگا کہ یہ میری والدہ کی نشانی ہے یعنی اسے اس کی والدہ نے جھاڑو سے مارا تھا اور وہ اس سے نہیں نکالے گا۔ بہر حال میں نے بڑی بحث و تکرار کے بعد تیلا نکالا۔ اس کے علاوہ بھی چند ایک واقعات ہیں جو نا قابل تحریر ہیں۔

میں جب میٹرک کا امتحان دے چکا تو میں نے بھلہ سٹاپ واقع ایک سنٹر میں جہاں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سکھائی جاتی تھی وہاں داخلہ لے لیا اور یہ دونوں سیکھے۔ ٹائپنگ تو میں اب بھی کر لیتا ہوں مگر شارٹ ہینڈ پریکٹس نہ ہونے کے میں بھول چکا ہوں۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ کے بعد میں نے بسطامی روڈ پر واقع عدنان انسٹیٹیوٹ سے ریفریجیشن ایئر کنڈیشننگ کورسز اور ٹوفل ٹیسٹ کا چھ ماہ کا کامیاب کورس کیا اور ٹیکنیکل بورڈ نے مجھے سند جاری کی۔ اس کے علاوہ میں نے Toefl جو کہ امریکن یونیورسٹی میں داخلہ کیلئے ضروری تھا میں حصہ لیا اور اس کا امتحان فلیٹیز ہوٹل میں ہوا۔ میرے ساتھ میرے ماموں زاد بھائی عارف ظفر بھی شامل تھے اور میرے پیچھے براجمان تھے انہیں نگران نے یہ کہہ کر اٹھا دیا کہ آپ نقل مت کریں اور وہاں سے اٹھا کر کہیں دوسری جگہ بیٹھا دیا۔ میرے ٹوٹل میں 490 سکور تھے میرے اپنے دوستوں میں دوسرے نمبر سکور تھے اور ندیم انصاری کے سب سے زیادہ شاید 600 کے قریب تھے۔ باقی منظر، عارف، ریحان ان سب سے ٹوفل میں میری پوزیشن بہتر تھی۔

میرے بڑے بھائی تنویر کو ملٹری سمری کورٹ نے دو سال کی قید سنائی اور اسے کوٹ لکھپت جیل سے ساہیوال جیل منتقل کر دیا گیا۔ میرے والدین کے لئے ہم سب کی ملاقاتیں کرنا بہت مشکل کام

تھا۔وہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اپنے خون کے ہاتھوں مجبور ہماری سب بھائیوں کی ساہیوال، ملتان اور کوٹ لکھپت جیل ملاقاتیں کرتے۔حالانکہ وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کو بڑھاپے میں یہ وقت دیکھنا پڑے گا۔

کوٹ لکھپت جیل منتقلی

تقریباً ڈیڑھ ماہ شاہی قلعہ رہنے کے بعد سیل نمبر 14 سے مجھے کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا گیا میرے ساتھ باقر شاہ جو آج کل ڈنمارک ہے وہ بھی جیل منتقل ہوا۔کوٹ لکھپت جیل میں تقریباً ڈیڑھ سال بحیثیت حوالاتی بند رہا۔جیل آتے ہی ہماری سب کی جو شاہی قلعہ سے آئے تو پٹائی ہوئی۔ حالانکہ ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم آدھے آزاد ہو گئے ہیں مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔

کوٹ لکھپت کا سپرنٹنڈنٹ مسعود قریشی نامی شخص تھا جو بہت ظالم آدمی تھا۔ہمیں جیل کے گیٹ سے پھانسی پھہرے جا کر بند کر دیا گیا۔وہاں پہلے سے مختلف سیلوں میں پیپلز پارٹی کے بند حوالاتی تھے۔جن میں میاں جہانگیر، زبیر، بابر اور بہت سے حوالاتی دانی، شہباز وغیرہ پہلے سے بند تھے۔ہماری ہر روز اڑتی لگتی یعنی روز سیل تبدیل ہوتے اور ہمیں دو حوالاتیوں کو ایک ایک ہاتھ باندھ کر ہتھکڑی سے پونے گھنٹے کی ڈھٹائی ہوئی اور بروز بدھ پندرہ دن بعد ہمیں اپنے عزیزوں سے ملاقات کی اجازت تھی۔

کوٹ لکھپت جیل والدین سے پہلی ملاقات

مجھے جیل آئے ہوئے دو دن ہوئے تھے تو ملاقات کا دن آ گیا۔مجھ سے جیل حکام نے پوچھا تمہاری ملاقات آئے گی تو میں نے کہا نہیں، کیونکہ میرے گھر والوں کو میرے خیال سے علم نہیں تھا کہ میں جیل آ گیا ہوں۔مجھے سب سے آخری والے سیل میں اکیلا بند کر دیا گیا۔میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور مجھے ملاقات پر آنے والوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔میں فرش پر لیٹا درد سے نبرد آزما تھا۔مجھے اپنی والدہ کی آواز کان میں پڑی کہ مبین کہاں ہے؟ تو مجھے نہیں معلوم کہ میرا سر درد ایک دم غائب ہو گیا اور میں امی جان کے ہاتھ چومنے لگا۔اس ملاقات میں میرے لئے امی جان آم لائیں۔انہیں معلوم تھا کہ مجھے آم بہت پسند ہیں۔ملاقات تقریباً پونا گھنٹہ جاری رکھی۔

ہمارے والدین کو اس سلسلے میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑی اور انہیں گرمی میں بغیر سائے کے بہت پیدل چلنا پڑتا۔بڑھاپے میں ان کے لئے یہ مشقت بہت اذیت ناک اور صبر آزما تھی۔مگر وہ اپنی اولاد کی خاطر یہ سب تکالیف اُٹھا رہے تھے۔ایک مرتبہ میری والدہ بمعہ میری بڑی بہن ملیحہ کے ملاقات

کے لئے جیل آئیں تو وہ بہت رو رہی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ تمہارے والد نے نوید کو میجر شاہد کے حوالے کر دیا ہے۔ یعنی گرفتار کروا دیا ہے اور اب وہ شاہی قلعہ میں بند ہے۔ مجھے بھی اس خبر سے بہت دکھ ہوا۔

آغا تنویر، آغا مبین (راقم) اور آغا نوید کوٹ لکھپت جیل

آغا نوید میرا چھوٹا بھائی شاہی قلعہ میں تھا تو مجھے دوبارہ مزید تفتیش کے لئے کوٹ لکھپت جیل سے شاہی قلعہ منتقل کر دیا گیا اور ہاں مجھے دوبارہ سے سیل نمبر تین میں ڈال دیا گیا اور چند دنوں بعد مجھے سیل نمبر نو میں بند کر دیا۔ اس سیل کے باہر تنگ سی راہ گزر تھی اور سیل کی دوسری طرف اونچی دیوار تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اونچی دیوار کے اندر چن دیا گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ نوید پر لال قلعہ میں بہت تشدد ہوا ہے اور اس کی چھاتی کے بال نوچ نوچ کر چھاتی میں پیپ پڑ گئی ہے۔ میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔ مجھے چند روز شاہی قلعہ میں رکھنے کے بعد دوبارہ کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد نوید اور تنویر بھی تفتیش مکمل کروانے کے بعد کوٹ لکھپت جیل آ گئے اور ہم تینوں بھائی پھانسی احاطہ میں بند مختلف سیلوں میں تھے اور جس دن ہماری ملاقات یعنی بروز بدھ ہوتی تو ہم تینوں بھائیوں کو ایک سیل میں اکٹھا کر دیا جاتا۔ جیل میں سب بھائیوں کا کھانا وغیرہ گرم کرتا اور بذریعہ سنتری ان کے سیلوں میں پہنچاتا۔

پھانسی پہرہ سے قصوری پہرہ منتقلی

کوٹ لکھپت جیل میں حوالاتیوں کو خط و کتابت کی سخت ممانعت تھی۔ کوٹ لکھپت جیل میں ایک سنتری نصرت تھا وہ ہم بھائیوں کا دوست بن گیا۔ انہی دنوں میں گفتہ شیریں جو میری اب بیوی ہے امریکہ واشنگٹن سے پاکستان آئی ہوئی تھی تو نصرت سنتری ہماری خط و کتابت کا ذریعہ تھا۔ ایک دن میں نے گفتہ کے لئے خط لکھا ہوا تھا تا کہ نصرت سنتری کو دوں اور وہ ہمارے گھر پہنچا دے اسی دن میرے چھوٹے بھائی نوید نے بھی ایک خط لکھا ہوا تھا جو ضیا کے مارشل لاء کے خلاف ایک سخت تحریر تھی۔

اسی دن جیل حکام کو مخبری ہوگئی کہ خط و کتابت ہوتی ہے اور چھاپہ پڑ گیا جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سکندر کے زیر نگرانی پڑا۔ میں نے نصرت سے کہا کہ میرا خط جو گفتہ کے نام تھا اور نوید دونوں کے خطوط چھپا دو تو اس نے ان خط کو مٹی میں دبا دیا چونکہ مخبری پکی تھی اور وہ خطوط پکڑے گئے اس لئے انہوں نے اگلے دن مجھے الصبح اٹھایا اور مجھے ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ ملاحظہ میں وہ قیدی یا وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں

نے جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کی ہو تو میں آخری والے حوالے سے پیش ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت سے باندھے ہوئے تھے اور دو تین نمبردار میرے دائیں، بائیں اور پیچھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا یہ خطوط تم نے لکھے ہیں میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے آنکھ کا اشارہ کیا تو نمبرداروں نے مجھے گردن کی پشت پر مارنا شروع کر دیا۔ یہ نمبردار صحت منداور تندرست وتوانا تھے اور انہوں نے انگوٹھیاں پہنیں ہوئی تھیں انہوں نے مار مار کر میری گردن کی پشت سے خون نکال دیا اور جب ان کی انگوٹھیاں میرے خون رستے زخموں پر پڑتیں تو میں درد سے چلا اٹھتا۔ انہوں نے دس منٹ تک میری پٹائی کی اور بعد میں مجھے دوبارہ قصوری پہرہ میں بند کر دیا گیا اور میں کافی دیر تک درد سے بلکتا رہا۔ قصوری میرے دائیں طرف اقبال بیداں والا بند تھا اور بائیں طرف ثناء اللہ جو مارشل لاء کا پہلا عمر قید سزا یافتہ تھا۔ اقبال کا نام بیدال والا اس لئے پڑا کہ اس نے کیمپ جیل میں سب سے زیادہ بید کھائے تھے اور ثنا اللہ کروڑوں روپے بنک فراڈ سے کما چکا تھا۔ اقبال بیداں والے کی آواز بہت اچھی تھی اور وہ مجھے اس کا ایک گانا جو کہ نور جہاں نے گایا تھا آج بھی یاد۔ ہے تمہاری آرزو میں میں کوچۂ قاتل تک آپہنچے چلے آؤ۔ میری جیل حکام نے ملاقات دو ماہ تک بند کر دی تھی اور کھانے میں دال روٹی اور ان دنوں گرمی بھی عروج پر تھی تو میں بوجہ کمزوری ونقاہت اپنے سیل میں بے ہوش ہو گیا تو مجھے نہیں معلوم مجھے کب اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا جہاں مجھے ڈرپ لگائی گئی۔ ہسپتال کے قریب ہی ایک سیل ان لوگوں کا تھا جو جیل حکام کے مطابق پاگل تھے اور اسی میں میرا بڑا بھائی آغا تنویر بھی بند تھا اور میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے مل سکوں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہسپتال میں میرے ساتھ والے بستر پر ایک سکھ لیٹا ہوا تھا جو نشہ کر کے بارڈر کراس کر کے پاکستان آ گیا تھا اور بعد میں بارڈر فورس کی فائرنگ سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ سکھ جب پاگل ہو جائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور اب ہم اندرا گاندھی کے خلاف ہیں اور اسے نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے دوسرے دن دوبارہ قصوری پہرے میں بند کر دیا گیا۔

قصوری پہرہ میں ادریس طوطی اور رزاق جھرنا کو پھانسی

میں نے قصوری پہرہ میں تقریباً دو ماہ گزارے۔ میرے وہاں قیام کے دوران چار مختلف افراد کو پھانسی دی گئی۔ جن میں قصور کا ایک شخص تھا اس کی آخری ملاقات میں بڑی خاموشی تھی جو ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ آخری ملاقات کے دوران بہت رونا دھونا ہوتا ہے جو ایک فطری بات ہے تو معلوم ہوا کہ اس شخص کے عزیزوں، رشتہ داروں کو منع کیا تھا کہ میری آخری ملاقات میں کسی نے نہیں رونا اس

طرح ہمارے دشمنوں کو خوشی ہو گی۔

اس کے علاوہ دو بھائی جن کا تعلق لاہور سے تھا اور وہ قلعہ گجر سنگھ سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام بھولا اور رشید تھا۔ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک حافظ قرآن کو اس لئے قتل کر دیا کہ وہ انہیں جواء کھیلانے سے منع کرتا تھا۔وہ ہماری سامنے والی بیرک میں بند تھے۔شام کو انہیں جب بلیک وارنٹ ملے تو ان کی حالت بہت خراب تھی۔ان میں سے ایک بھائی باآواز بلند گانا گا رہا تھا ان کا بھی غم ہے اپنا بھی غم ہے اب دل کے بچنے کی امید کم ہے۔سنا ہے ان کو جب پھانسی گھاٹ کی طرف لے کر جایا جا رہا تھا تو وہ دونوں بھائی بہت پس وپیش کر رہے تھے اور جیل حکام نے انہیں گھسیٹ کر تختہ دار تک پہنچایا۔چوتھا شخص عبدالرزاق جھرنا تھا جسے چودھری ظہور الحق کے قتل کے الزام میں اسے سزائے موت ہوئی تھی، حالانکہ پہلے سمری ملٹری کورٹ کے جج نے اسے بری کر دیا تھا،لیکن دوبارہ سماعت کرنے اسے سزائے موت سنائی گئی۔سنا ہے کہ بھٹو کے نعرے لگا تا ہوا تختہ دار پر چڑھ گیا۔

انڈین طیارے کا اغوا

جب میں جیل میں تھا تو انڈیا کا ایک طیارہ اغوا کیا گیا جو سکھ تحریک آزادی خالصہ نے کیا انہیں جیل میں وی آئی پی سہولتیں حاصل تھیں۔یعنی وہ بیڈمنٹن کھیلتے ،ٹیپ ریکارڈ سنتے اور انہیں ٹیلی فون وغیرہ کی بھی سہولتیں تھیں۔میری ملاقات جن دنوں میں ہسپتال میں تھا ایک سکھ سے ہوئی جو ہائی جیکنگ میں ملوث تھا۔سکھ نے کہا کہ ہمیں یہاں بہت آسانیاں مہیا ہیں جبکہ ہم پاکستانی ہوتے ہوئے بھی سخت پابندیوں کا شکار ہیں تو اس نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس سیاسی پارٹی سے ہے میں نے جواب دیا پیپلز پارٹی سے۔اس نے کہا کہ ہمیں تو ضیاء حکومت میں بہت سپورٹ حاصل ہے اگر پیپلز پارٹی کی حکومت آ گئی تو ہمیں بہت نقصان ہو گا۔

کیمرہ ٹرائل سمری ملٹری کورٹ سزا 1984

اس کے علاوہ میں قصوری پہرہ میں تھا کہ امجد اسلام امجد نے دورہ کیا وہ کوئی ٹی وی سیریل تحریر کر رہا تھا جس میں جیل سے متعلقہ کچھ سین تھے اور وہ خود اس کا مشاہدہ کرنے کے لئے جیل کا دورہ کر رہا تھا۔میں تقریباً دو ماہ تک قصوری پہرہ میں بند رہا اور پھر مجھے دوبارہ بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔تقریباً ڈیڑھ سال بعد راقم کا سمری ملٹری کورٹ جو کہ کوٹ لکھپت جیل میں ہی شروع ہوا۔ مجھے سمری ملٹری کورٹ کے جج میجر افضل کے سامنے پیش کیا تھا اور مجھے فرد جرم پڑھ کر سنائی گئی جس میں تحریر تھا کہ میں

نے الذوالفقار کے کارکنوں کی مدد کی اور جانتے ہوئے کہ وہ تخریب کار ہیں انہیں قانون کے حوالے نہ کیا گیا۔اس نے میجر سے پوچھا کہ کیا میں وکیل کر سکتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تم جلد از جلد اپنا بیان تحریر کراؤ تا کہ تمہیں سزا سنائی جا سکے۔ دوسرے دن مجھے تین سال سزا سنا دی گئی۔ مجھے سزا سنا کر چکر جو کہ جیل کے اندر ایک جگہ ہے جہاں حوالاتیوں کو قیدی ہونے کے بعد قیدیوں والے کپڑے پہنائے جاتے ہیں میں بھی قیدیوں والی شلوار قمیص بمعہ ٹوپی پہنائی گئی میں جب قیدی لباس سے چکر کے قریب بیٹھا ہوا تو نوید میرا چھوٹا بھائی مجھے بیرک کے گیٹ کی چھید سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لہرا کر اپنے مطمئن ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

ملتان جیل منتقلی 1984

اب چونکہ میں قیدی بن گیا تھا اس لئے مجھ سے مشقت لینا لازمی تھی تو ہمیں نواڑ بنانے کی مشقت سونپی گئی جو کہ شروع ہفتہ تو قریباً دس فٹ تھی لیکن بعد میں بیس فٹ کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد کوٹ لکھپت ہی مشقت کی بعد میں ہمیں یعنی مجھے، باقر شاہ اور کچھ اور قیدیوں کو ملتان جیل منتقل کر دیا گیا۔ ہمیں بذریعہ ٹرین ملتان جیل بھیجا اور مجھے اور باقر اور دیگر قیدیوں کو بیڑیاں لگی ہوئی تھیں تو ملتان جب ہم ریلوے سٹیشن پہنچے تو ہمارے اردگرد پولیس کے کمانڈوز نگرانی کے لئے تھے اور مجھے یاد ہے ایک معصوم بچہ ہمیں دیکھ کر ڈر گیا اور اپنی والدہ کے ساتھ چپک گیا۔

ملتان جیل ہمارا ملاحظہ ہوا تو بعد میں ہمیں ایک بیرک میں لے گئے اور ہمیں الگ الگ سیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ملتان جیل کا سپرنٹنڈنٹ چیمہ تھا جو بہت بہتر انسان تھا اور اس کا قیدیوں سے رویہ مناسب تھا۔ جس بیرک میں ہمیں بند کیا گیا وہ دو منزلہ تھی۔ ہماری روٹین یہ تھی کہ ہم سب کو الصبح اٹھا دیا جاتا وہاں ہم خود پکا سکتے تھے اور کھانے میں گوشت کی اجازت بھی تھی۔ ہم وہاں ڈنڈ بیٹھک نکالتے اور سردائی پیتے جس سے نیند خوب آتی۔ اسی بیرک میں میرا بھائی آغا نوید بھی بعد میں قیدی بن کر آ گیا اور تو میں ہم دونوں بھائیوں کو اکٹھا ایک سیل میں بند کر دیا گیا۔ جہاں ہم دونوں کھانا وغیرہ خود بناتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے چنے کی دال کا حلوہ بنایا جو بہت مزیدار بنا اور ہم نے کئی دنوں تک کھایا اس کے علاوہ ہم نے بکرے کا مغز بھی بنایا اس میں مشورہ نوید کا ہوتا اور پکاتا میں تو یہ بھی مزے کا بنا۔ ہم نے ایک مرتبہ جیل میں سب نے ٹینڈیں کروالیں وہاں ہمارے ساتھ نادر، ڈاکٹر اشفاق، اسحاق وکیل بھی تھے۔ کچھ عرصہ بعد جو الذوالفقار کے ٹرینڈ کمانڈوز تھے ان سب کو عمر قید کی سزا ہوئی تو ان کی آمد پر ہم قیدیوں کو

ایک بہتر بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ جو دو بڑے بڑے ہالوں پر مشتمل تھی اور اس کا گراؤنڈ بھی بہت بڑا تھا۔

جب ہم وہاں منتقل ہوئے تو پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر جہانگیر بدر بھی وہاں ساتھ والی بیرک میں نظر بند تھے۔ وہاں انہیں بہت سہولتیں میسر تھیں یعنی جیل کی طرف سے اخبار، مشقتی جو کھانا پکانے اور ان کو کپڑے وغیرہ دھوتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں آغا نوید اور مجھے جہانگیر بدر اکثر ناشتے پر بلاتا اور ہم لوگ جہانگیر بدر کے ساتھ شطرنج بھی کھیلتے۔ وہاں جہانگیر بدر کے پاس ایک انگلش کی موٹی سی کتاب تھی جس کا موضوع جنسیات پر مبنی تھا ایک مرتبہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے یہ کتاب پڑھنے کے لئے دو تو کہنے لگا آغا صاحب آپ کی قید لمبی ہے اور ایسی کتاب پڑھنے سے قید کاٹنا مشکل ہو جائے گی سو میں اس کتاب سے محروم رہا۔

جب جیل میں سپرنٹنڈنٹ کا دورہ ہوتا تو ہمیں ٹاٹ پر بیٹھا دیا جاتا اور ہمیں حکم تھا کہ اوپر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا لیکن ہمارے ساتھ آصف بٹ نے جبکہ آئی جی جیل خانہ جات کا دورہ تھا تو وہ بجائے ٹاٹ پر سیدھا بیٹھنے کے الٹا بیٹھ گیا۔ احتجاجاً تو آئی جی جیل خانہ جات نے اس کا بہت برا منایا اور کہا کہ It is Highly Insulting اسی پہرے میں جہانگیر بدر کو سپرنٹنڈنٹ کے دورے پر کرسیوں پر بیٹھایا جاتا اور ہم لوگ قیدی لباس میں ٹاٹوں پر بیٹھتے۔ جہانگیر بدر کچھ عرصہ بعد دوسری بیرک چلے گئے اور جلد رہا ہو گئے۔ میرے چھوٹے بھائی آغا نوید کی تلخ کلامی بہت عروج پر تھی اور اس کا نقطہ نظر سب سے مختلف ہوتا یوں جیل میں اس کی اکثر لوگوں سے لڑائی رہتی۔ بیرک میں ہم بہت سے قیدی بند تھے اس لئے سیالکوٹ کے دو لڑکوں کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ آپس میں گڑ بڑ کرتے ہیں تو نوید نے ان کی سخت بے عزتی کی۔ وہ نوید کے خلاف ہو گئے اور بیرک میں لڑائی ہو گئی جو جیل مینوئل کی سخت خلاف ورزی تھی۔ میں جیل میں تہبند پہنے ہوئے اس لڑائی میں اپنے بھائی کا ساتھ دے رہا تھا کہ میری اس مارا ماری میں تہبند اتر گئی اور مجھے سخت ندامت کے ساتھ پٹائی بھی ہو رہی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل ہماری بیرک میں آیا تو ہم نے اسے واقعہ کے بارے میں بتایا اور اس لڑائی کا ذمہ میں نے اپنے سر لے لیا۔ بہرحال میری جیل میں اچھی رپورٹ کی وجہ سے مجھے صرف وارننگ دی گئی اور میں صاف بچ گیا۔

ضیاء الحق کا ریفرنڈم۔ ملتان جیل

ہم ملتان جیل میں تھے ضیاء الحق نے ریفرنڈم کروایا کہ آپ اگر پاکستان میں اسلام چاہتے

ہیں تو میں یعنی ضیاء الحق اقتدار میں رہوں گا۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ اس کی اصل عبارت کیا تھی لیکن وہ پاکستان کی تاریخ کے بڑے ڈراموں میں سے ایک ڈرامہ تھا۔جیل حکام نے کہا کہ جو اس ریفرنڈم میں ووٹ ضیاء الحق کی حمایت میں دے گا اسے سہولتیں دی جائیں گی اور جس نے مخالفت کی اسے بیڑیاں پہنا دی جائیں گی۔ہم سب نے ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا کیونکہ جیل حکام نے سامنے ووٹ ڈلوانے تھے تو سیالکوٹ کے کھوکھر نے کہا کہ وہ ووٹ ڈالے گا اور اس نے ہم سب کی جگہ جعلی ووٹ ڈالے اور جیل حکام سے سہولتیں لیں جبکہ ہم سب کو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔

ملتان جیل میں ہمیں ایک مرتبہ عام قیدیوں کے ساتھ بیرکوں میں رکھا جو کہ ہمارے لئے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ میں آپس میں ایک دوسرے کو جان چکے تھے اور ایڈ جسٹ ہو چکے تھے۔ہم سب سیاسی قیدی تھے اور میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ضمیر کے قیدی قرار دیا ہوا تھا۔ہم نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو کہا کہ ہمیں عام قیدیوں کی بیرک سے نکالو ورنہ ہم بھوک ہڑتال کریں گے تو اس نے ہم سب کو جلدی پھر ہماری پرانی بیرک میں بند کر دیا گیا۔ملتان جیل میں ہم سے مشقت نہیں لی گئی۔

ملتان جیل سے شاہی قلعہ برائے تفتیش منتقلی

راقم اور آغا نوید کو ایک مرتبہ ملتان سے پھر شاہی قلعہ طلب کیا گیا بوجہ مزید تفتیش کے تو ہمیں جس ٹرک نما بس میں بیٹھایا گیا اس میں بہت سے قیدی پاگل تھے اور عجیب وغریب حرکات کر رہے تھے۔گرمی بھی شدت کی تھی اس طرح ہمارا سفر بہت ناگوار گزرا۔اب بھی جب اس سفر کا تذکرہ کر رہا ہوں یوں تو میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔ہم دونوں بھائیوں کو دوران سفر بیڑیاں پہنائی ہوئی تھیں۔ جب یہ ٹرک نما بس دیگر قیدیوں کو کوٹ لکھپت اتار چکی تو ہم دونوں بھائیوں کو لے کر شاہی قلعہ کی طرف بھاٹی گیٹ پہنچی تو صبح کے ناشتہ کا وقت ہو رہا تھا اور ہم نے پولیس والوں کو کہا کہ ناشتہ چنے اور تل والے کلچوں کا کرنا ہے تو ہمیں جواب ملا اب آپ شاہی قلعہ ہی ناشتہ کریں گے۔ہم دونوں بھائی تقریباً ایک ہفتہ شاہی قلعہ رہے اور ہمیں پھر سے سنٹرل جیل ملتان منتقل کر دیا گیا۔

ملتان جیل میں پڑھائی لکھائی کا بہترین ماحول تھا اور میں نے وہاں بہت مصروف وقت گزارا جیسے ہوسٹل میں رہ رہا ہوں۔وہاں میں باقاعدہ ورزش کرتا، کھانا پکاتا اور خوب کتابیں پڑھتا۔نوید اپنی کتاب دوسرا جنم لکھتا رہا اور اس نے بھی بہت اس ماحول سے فائدہ اٹھایا۔اس بیرک میں ہمیں بنگالی مشقتی ملے ہوئے تھے جو ہمیں کپڑے وغیرہ دھو دیتے اور استری بھی کر دیتے۔ملتان جیل میں گجرات

کے دو بھائی بٹ برادران تھے جو پہلوانی کے بہت شوقین تھے تو ہم میں اکٹھے ورزش کرتے اور بیٹھکیں نکالتے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں بتایا کہ میں ہزار مرتبہ ایک ہی باری میں دو اینٹوں کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ڈنڈ نکال سکتا ہوں وہ چونکہ پہلوان تھے کہنے لگے تم ایسا نہیں کر سکتے اور ہماری شرط لگ گئ جو میں با آسانی جیت گیا بلکہ میں نے ہزار کی بجائے بارہ سو ڈنڈ نکالیں اور بٹ برادران کو ہمیں بہترین کھانا کھلانا پڑا۔

اسی بیرک میں جہاں ہم رہتے تھے ایک قیدی مبین ٹھسا تھا۔ جو بہت دلچسپ آدمی تھا سنا ہے اس نے ملتان کے کسی بدمعاش پر فائرنگ کی تھی تو اس کی گولی چلنے کی بجائے ٹھس ہوگئ جس سے اس کا نام مبین ٹھسا پڑ گیا اور اس بدمعاش نے بعد میں اسے مار مار کر اس کی ٹانگیں توڑ دی۔ مبین ٹھسا جیل میں بہت ہنساتا اور ڈرامے وغیرہ بھی کرتا ہے بعد میں اسے ملتان میں قتل کر دیا گیا۔

میری شدید خواہش تھی کہ میں ملتان جیل سے ایم اے کا امتحان دے دوں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار نوید سے کیا تو وہ کہنے لگا کہ تمہارے والدین اتنی مشکل سے ملاقات کرتے ہیں تو وہ تمہارے ایم اے امتحان کی فیس کیسے دیں گے؟ یوں مجھے اس بات کا آج تک افسوس ہے کہ میں ایم اے کا امتحان پاس نہیں کر سکا۔

ملتان جیل میں یوگا

ملتان جیل میں بند ایک انڈین قیدی جو کہ جاسوسی کے الزام میں سزا کاٹ رہا تھا اس کا نام رمضان تھا اور وہ بھی ہمارا مشقتی تھا ایک مرتبہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری عمر کتنی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ چالیس سال ہوگی تو کہنے لگا کہ میں پچپن سال کا ہوں۔ میں نے اس سے اس کا راز پوچھا تو اس نے جواب دیا میں پندرہ سال سے جیل میں بند ہوں اور یوگا کرتا ہوں اور پھر میں نے سنجیدگی سے یوگا شروع کر دیا اور اس میں بہت مہارت حاصل کر لی۔

ملتان جیل سے رہائی 18-11-1985

نومبر 1985ء سے ملتان جیل سے تین سالہ قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ ہم چونکہ سینئر قیدی ہمیں جلد رہا کیا جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا اور ہم سے بعد والے قیدی رہا ہوتے رہے اور خدا خدا کر کے 11 نومبر 1985ء میں میری اور نوید کی رہائی کے آرڈر ملتان جیل پہنچ گئے۔ یوں تقریباً دو سال اور سات دن بعد قید رکھنے کے بعد مجھے رہائی ملی۔ مجھے یاد ہے جب

مجھ سے جونیئر قیدی جب رہا ہوئے تو میری حالت غیر ہو جاتی اور میں احاطہ میں لگے گھاس کو پاؤں سے زور سے بھینچا اور گھاس کے ٹوٹنے کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

راقم اور آغا نوید کو سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس نے ہمیں مبارک باد دی لیکن نوید کو کہا کہ آپ اگرچہ مقدمہ نمبر 211/81 میں رہا ہو چکے ہیں مگر آپ دوسرے مقدمہ میں مطلوب ہیں لہٰذا آپ کو مزید آرڈر تک آپ یہیں ملتان جیل میں رہنا پڑے گا۔ یہ سن کر نوید کی حالت غیر ہوگئی اور جب اسے واپس بیرک بھیجا جا رہا تھا تو اس کا رنگ زرد تھا۔ بعد میں اس نے امی جان کے نام ایک جذباتی خط تحریر کیا۔ میں بلکہ اپنے بارے میں غیر یقینی تھا کہ کہیں مجھے دوسرے کیس میں جیل میں نہ رکھ لیں مگر ایسا نوید کے ساتھ ہو گیا۔اس طرح میری رہائی کی خوشی پھیکی پڑ گئی اور میں جب ملتان جیل کے مین گیٹ سے باہر آیا تو مجھے آزاد دنیا دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے قدم آگے بڑھنا بھول گئے ہوں۔

جیل میں ہمارے ساتھ مزدور کسان پارٹی کے رہنما عزیز جن کا تعلق ملتان سے تھا انہوں نے مجھے رہائی کے وقت اپنا فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ رہائی ملے تو میرے گھر آ جانا تو میں ان کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان کے گھر سے لاہور اپنے گھر فون کیا اور بتایا کہ میں رہا ہو گیا ہوں جبکہ نوید کو کسی اور کیس میں وہیں جیل رکھا گیا ہے۔ مجھے باجی ملیحہ نے بتایا کہ لاہور سے ابا جان تمہیں لینے آ رہے ہیں تب تک میں وہیں رہا۔ میرے والد مرحوم عزیز صاحب کے گھر آئے اور ہم تقریباً سہ پہر پانچ بجے کوچ میں بیٹھ کر لاہور روانہ ہوئے۔

جب میں لاہور پہنچا تو گھر کے باہر میں نے ابا جان سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے صحن سے دیکھا کہ امی جان، باجی ملیحہ، گوشہ بھائی اور بھائی وقار اندر نگر گھر میرے منتظر تھے۔

تو میں اس سے پہلے ابا جان کوئی جواب دیتے چپکے سے سب کے سامنے نمودار ہو گیا۔امی جان میرے گلے لپٹ کر بہت روئیں۔

جیل سے رہائی کے بعد سب سے بڑی پرابلم جو پیش آئی وہ معاشی بدحالی تھی۔ بوجہ سزا یافتہ نوکری ملنا تو ناممکن رہا اور جب کچھ نہ بن پاتا تو پراپرٹی کا کام شروع کر دیا۔ دفتر مسجد کے ساتھ منسلک دوکان میں کھولا اور نام رکھا M&T اسٹیٹ ایجنسی کا کام شروع کیا جس میں طارق جس کا تعلق سیالکوٹ سے تھا پارٹنر تھا۔ یوں ہم دونوں نے مل کر یہ کام شروع کیا اور اس میں ہم بری طرح ناکام رہے کیونکہ اس

کاروبار میں سراسر جھوٹ اور فراڈ تھا۔

اس دوران ندیم، ولید اور وسیم تینوں بھائی کابل میں تھے اور اس کوشش میں تھے کہ یورپ نکل جائیں اور بعد میں بذریعہ ہوائی جہاز کے ذریعے تینوں کابل سے ڈنمارک پہنچ گئے۔ جو کہ ایک خوش آئندہ بات تھی، لیکن ہماری مالی مشکلات جوں کی توں تھیں۔نوید رہائی کے بعد اپنے پرنٹنگ کے کام میں مصروف ہو گیا اور وہ کچھ نہ کچھ کما لیتا مگر میری پوزیشن مالی بہت خراب تھی۔

گفتہ شیریں کی امریکہ سے واپسی

میری رہائی کے چند دن بعد گفتہ شیریں کا امریکہ واشنگٹن سے فون آیا۔ وہ مجھ سے شکوہ کر رہی تھی کہ میں نے اسے اپنی رہائی کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ میں نے اسے کہا کہ میں بوجہ ایسا نہیں کر سکا۔اسی دوران ہمارے گھر کا مقدمہ چلتا رہا۔ہمیں یہ معلوم تھا کہ یہ اوقاف کی پراپرٹی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی قاضی صاحب ہیں جن کی یہ پراپرٹی ہے۔ ہمارے محلے میں ایک وکیل مولا بخش تھا جو کہ کسی زمانے میں بیگم کا منشی تھا۔بیگم کی وہاں بہت پراپرٹی تھی۔ اس لئے وہ بسطامی روڈ اِندرنگر کے سارے علاقے کی الف ب سے واقف تھا۔اس وکیل نے میرے والد مرحوم کو یہ مشورہ دیا کہ میں اس مقدمہ کو لمبا کرتا جاؤں گا تو اس طرح قاضی لوگ تھک کر کوئی سمجھوتہ کر لیں گے۔اس طرح وہ اور ہم آخر کار مقدمہ ہار گئے۔ بعد ازاں محکمہ اوقاف والوں نے دعویٰ کر دیا کہ یہ ہماری وقف پراپرٹی ہے مگر ہم وہ مقدمہ پھر ہار گئے اور کورٹ نے ہمیں گھر خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ ہم سب لوگوں کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا اور والد مرحوم نے تو اس کا اتنا غم کیا کہ ان کو چپ سی لگ گئی۔

شادی بتاریخ16-01-1987

گفتہ شہر میں 1986ء میں امریکہ سے پاکستان آ گئی منصورہ نے گفتہ کو سمجھایا کہ تم پاکستان نہ جاؤ بلکہ مبین یعنی راقم کو وہ امریکہ بلا لیں گے لیکن گفتہ نہ مانی۔ گفتہ سے میرا ٹیلی فون پر رابطہ ہوا۔ 3 اپریل 1978ء میں مجھے بوقت 4 بجے ایک لڑکی کا فون آیا اور بعد میں یہ سلسلہ 16 جنوری 1987ء کو ہم دونوں کی شادی پر منتج ہوا۔اگرچہ گفتہ سے میری فون اور خط و کتابت سے رابطہ تھا اور میں نے اس کی تصویر بھی دیکھ چکا تھا مگر پہلی مرتبہ میں نے اسے سمن آباد میں اس کی کزن شاید فریدہ کے ساتھ سمن آباد پرانی مارکیٹ دیکھا لیکن وہ صرف ایک جھلک ہی تھی۔ میرے ساتھ اس وقت منظر بھی تھا اور ہم دونوں حسنین کی موٹرسائیکل پر سوار تھے۔

ہماری شادی نارمل حالات میں نہ ہوئی۔ میں نے اپنی والدہ کو بتادیا کہ میں نے گفتہ سے شادی کرنی ہے تو میری والدہ نے کہا شادی کے لئے پیسے چاہئیں جو میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں شادی نہایت سادگی سے کرنا چاہتا ہوں انہوں نے اس پر جواب دیا اس طرح ہماری ناک کٹ جائے گی۔

گفتہ اور میں نے شادی سے قبل رحمان پورہ میں کرایہ کا مکان لے لیا تھا اور ضرورت کا سامان بھی۔ ہم نے شادی کے کپڑے بھی انارکلی سے سلوائے۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا اور گفتہ ہی امریکہ سے لائے ہوئے ڈالر خرچ کرتی رہی۔ حتیٰ کہ نکاح والے دن بھی میرے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ نکاح خواں پیسے دینے ہیں۔ ہانو جان نے خوش قسمتی سے مجھ سے پوچھ لیا کہ نکاح خواں کے لئے کچھ رقم ہے تو میں نے جواب دیا نہیں، تو انہوں نے میری جیب میں پانچ سو روپے۔ سوسو والے پانچ نوٹ ڈال دیئے اور کہا کہ نکاح خواں کو دوسو روپے دینا۔ میری شادی میں میرے ماموں زاد بھائیوں سلیم، ناصر اور وسیم ناصر نے میرا بھرپور ساتھ دیا جبکہ صولت انصاری نے بھی میری مالی اور اخلاقی مدد کی۔ گفتہ کے گھر والوں نے سب ہی نے شرکت کی۔ مٹھائی اور چھوارے وغیرہ صولت انصاری اور سلیم ناصر لے کر آئے۔ مختصراً مہندی کی رسم بھی ادا کی گئی۔ لڑکی والوں کی طرف سے سید ابوالحسن شاہ اور منسوب گواہ بنے اور میری طرف سے سلیم ناصر اس طرح میری شادی گفتہ سے ہو گئی۔ شادی والے دن میں نے آف وائٹ شلوار قمیض پہنی تھی۔ گفتہ نے مجھے کہا تھا کہ رخصتی کے وقت دوسرا جوڑا پہن لینا لیکن میں نے وہی جوڑا پہنے رکھا۔ نکاح کے بعد میں گھر جو ہم نے کرایہ پر لیا تھا واپس آیا اور نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ صولت انصاری، وسیم ناصر اور سلیم ناصر گھریلو اشیاء لینے بازار چلے گئے، لیکن جب وہ آٹھ بجے تک واپس نہ ہوئے تو مجھے اس تاخیر پر پریشانی ہوئی اور میں رکشہ لے کر باوا پارک لڑکی والوں کے گھر یعنی سید ابوالحسن شاہ کے گھر گلبرگ پہنچ گیا تو باہر گفتہ کے والد افضل خاں گیٹ پر کھڑے میرا انتظار کررہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا اور میں اندر چلا گیا۔ وہاں دودھ پلائی کی رسم ہوئی اور تصاویر اتاری گئیں۔ ہانو جان کے علاوہ گفتہ کے دیگر رشتہ داروں نے بھی شرکت کی۔ بعد میں صولت، وسیم ناصر اور سلیم ناصر صولت کی گاڑی FX-80 میں بیٹھ کر آ گئے اور میں گفتہ، سلیم ناصر، صولت اور گفتہ کی بہن چاندنی اپنے گھر رحمان پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں صولت سے گاڑی لگ گئی اور بند ہو گئی۔ صولت نے کہا کہ یار گاڑی کو دھکا لگانا پڑے گا تو مجھے بھی سلیم کے ساتھ دھکا لگانا

پڑا تو کافی دیر بعد گاڑی سٹارٹ ہوئی تو صولت شرارتاً گاڑی لے کر آگے چلا گیا اور ہم دونوں کو وہیں چھوڑ گیا۔آگے چل کر اس نے گاڑی روکی اور ہم دونوں رحمان پورہ والے گھر پہنچے۔گھر کو جھنڈیوں سے سجایا ہوا تھا اور سیج بھی پھولوں سے مزین تھی۔یہ سارا کام صولت،وسیم اور سلیم نے میری غیر موجودگی میں کیا تھا اس طرح ہماری شادی کا واقعہ اختتام پذیر ہوا۔

ملازمت اقبال بیگ (پلازا سنیما)

شادی کے بعد مجھے روزگار کی فکر لاحق ہوئی، کیونکہ مجھے طعنے دیئے جا رہے تھے کہ بیوی کے خرچ پر گزارہ کر رہا ہوں۔شادی کے پندرہ دن کے بعد میں حاجی اقبال بیگ کے دفتر پلازہ سینما گیا اور اسے اپنے والد کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے نوکری کی درخواست دی جو اس نے منظور کر لی۔یوں میں شاید فروری کے مہینے 1987ء کو اس کے پاس ملازم ہو گیا میں وہاں کبھی کبھار کوئی لیٹر ٹائپ کر لیتا یا بازار کے چھوٹے موٹے کام۔اس کے علاوہ وہاں اور کوئی کام نہیں تھا۔حاجی اقبال کے پاس جو وی آئی پی لوگ آتے تھے جن میں عابد سیٹھ، سہیل بٹ، مجاہد بٹ، شوکت جٹ، نعیم وغیرہ تھے۔حاجی اقبال کا خاص آدمی زاہد علیم تھا وہ میری حاجی کے پاس تقرری سے خوش نہیں تھا اور مجھے اکثر ڈانٹتا رہتا اس کی کوشش تھی کہ میں حاجی کو چھوڑ دوں۔پلازہ سینما میں فلمیں لگتی تھیں اور حاجی اقبال بیگ خود بھی فلمساز تھا تو اس کے پاس محمد علی، سلیمان ڈائریکٹر، بابرہ شریف اور بہت سے فلمی لوگ آتے تھے۔حاجی اقبال کی فلم "لو اِن لندن" بن رہی تھی تو حاجی نے مجھے کہا کہ ایک کلب کا سین ہے تم یعنی راقم ایسا کرو کہ کوئی سوٹ پہن کر آجاؤ اور اس طرح تم بھی فلم میں آجاؤ گے مگر میرے پاس سوٹ نہیں تھا۔اس طرح اس کلب کے سین میں نہ آسکا۔سہیل بٹ اور شوکت جٹ عیاش طبع لوگ تھے اور ہر طرح کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔حاجی اقبال بیگ نے پرانے تعلقات کے باوجود میری تنخواہ صرف ہزار روپے رکھی حالانکہ میں نے اسے بہت کہا کہ مجھے تنخواہ زیادہ ملنی چاہئے مگر اس نے یہ نہ کیا۔حاجی اقبال بیگ کا دوست حاجی شاہ زمان ایک دن سینما آیا تو ہم بھی اسے جانتے تھے چونکہ وہ میرے ساتھ شاہی قلعہ رہا تھا۔اور ندیم ولید وغیرہ کا دوست تھا میں نے اس لئے بھی کہا کہ مجھے حاجی سے کہہ کر میری تنخواہ بڑھاؤ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد حاجی نے مجھے یہ کہہ کر چھٹی کروا دی کہ میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔میرے خیال سے حاجی چونکہ شروع سے پیپلز پارٹی کے سخت خلاف تھا اور اس کے سب دوست مسلم لیگی تھے جو کہ اس کے پاس عیاشی کے لئے آتے تھے تو انہوں نے زاہد علیم سے مل کر میرے خلاف حاجی کو

بدظن کیا کہ تم نے کیا پیپلز پارٹی والا اپنے پاس رکھا ہوا ہے یوں میری انہوں نے چھٹی کروادی۔

جب میں اقبال کے پاس ملازم تھا تو اس نے مجھے ایک مرتبہ ہزار روپے والے پرائز بانڈز ہزاروں کی تعداد میں دیئے اور کہا کہ یہ قرعہ اندازی کی لسٹ لو اور جو پرائز بانڈ نکلے تمہارا۔ میں بہت خوش ہوا اور اوپر والی منزل میں بیٹھ کر کئی گھنٹے تک یہ دیکھتا رہا کہ کوئی پرائز بانڈ نکلے اور موج ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید حاجی کو معلوم تھا کہ کوئی پرائز بانڈ نہیں نکلا اور وہ ڈبل چیک کروانا چاہتا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں نیچے ایک لماری تھی جس کے اندر ہر وقت چالیس پچاس لاکھ نقد رکھتے اور کلوزنگ کے دن اقبال کے پاس بہت سے بینکوں کے منیجرز حاجی اقبال سے درخواست کر کے ان کے بینک میں حاجی اقبال زیادہ سے زیادہ پیسے جمع کروائے تا کہ وہ بیلنس شیٹ اچھی رکھ سکیں۔

حاجی اقبال کو مسز بیگ کا اکثر فون آتا تھا۔ وہ میرے بھائی ندیم کی واقف تھی اور بسطامی روڈ کسی زمانے میں رہتی تھی اور اسے بوجہ پیپلز پارٹی یعنی الذوالفقار سے تعلق رکھنے پر سزا بھی ہوئی تو مجھے بہت اچھے طریقے سے جانتی تھی تو میں جب فون اٹھاتا کیونکہ میں استقبالیہ کا کام بھی کرتا تھا تو وہ کہتی میں مسز بیگ بول رہی ہوں حاجی صاحب سے بات کروا دیں اور مجھے جانتے ہوئے بھی وہ مجھے نظر انداز کرتی۔ بعد میں معلوم ہوا اس نے مسز بیگ کا گھر گروی رکھ کر انہیں پانچ لاکھ دیئے تھے جو انہوں نے بمشکل ادا کئے۔

اقبال سے چھٹی کے بعد مجھے زاہد نامی شخص نے جو کافی عرصہ ہالینڈ رہ کر آیا تھا مجھے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ وہ شراب اور عورت کا رسیا تھا اور بعد ازاں اس نے پیپلز پارٹی (بھٹو شہید گروپ) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے تین ہزار روپے تنخواہ دے گا اور اس کے پاس رہائش بھی ہے مگر وہ جھوٹا نکلا اور میں نے چند روز اس کے پاس کام کیا اور وہاں سے رخصت لی۔

والدہ صاحبہ سے تعلقات استوار

میری شادی کے چند روز بعد میں نے اپنی والدہ کے گھر فون کیا تو میری چھوٹی ہمشیرہ سمعیہ جو ابھی پاکستان ہی تھی اس نے گفتہ کو کہہ کر مبین ہمارے لئے مر گیا ہے۔ اس لئے ہمارا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اس کی جذباتی بات تھی، لیکن تقریباً میری شادی کے بعد برف پگھلنا شروع ہوئی اور میری والدہ، ملیحہ باجی اور سمعیہ بمعہ میری خالہ ارشاد ہمارے گھر واقعہ رحمان پورہ آئیں اور ہم دونوں نے ان سب کی خوب آؤ بھگت کی اور پھر ہم دونوں یعنی گفتہ اور میں اپنے پرانے والدین کے گھر واقعہ بسطامی

روڈ چلے گئے۔نویداور سب اہل خانہ نے مل کر ہمارے لئے الگ کمرے کا بندوبست کیا اور اس میں ٹی وی بھی رکھا، ہمارا گھر چونکہ پرانا تھا اس لئے چند روز بعد وہاں بارش سے چھت ٹپکنے لگی اور ٹی وی بھی خراب ہو گیا۔جس کمرہ میں ہم سوئے ہوئے تھے تو مجھے ایک رات بہت ڈر لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں کوئی سفید کپڑوں میں ملبوس عورت ہے لیکن مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا میں اتنا ڈرا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ایک دن میری نوید سے کسی بات پر لڑائی ہوئی۔اس کی وجہ گفتہ تھی اس نے گفتہ سے تلخ کلامی کی تھی تو جھگڑا بہت بڑھا۔گفتہ کہنے لگی میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی اور میرے اوپر بھی بھوت سوار ہو گیا۔میں اگلے دن گلشن راوی بلاک اے میں وحید کا گھر دیکھا اور اوپر والا پورشن کرایہ پر لے لیا اور انہیں تین ماہ کا ایڈوانس بھی دے دیا جس رات میں وہاں سے سامان ٹرالے پر لوڈ کر رہا تھا تو میرے والد مرحوم نے مجھے منت سماجت کی کہ میں نہ جاؤں مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ان کی بات اس وقت کیوں نہ مانی اور میں دیوار پھلانگ کر باہر آیا کیونکہ میرے والد مرحوم نے گیٹ بند کر دیا ہوا تھا اور گلشن راوی والے کرایہ کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔زندگی کی بہت سی تلخ باتوں میں یہ واقعہ بھی مجھے بے چین کر دیتا ہے،لیکن زندگی میں ایسے ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں جو انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

گلشن راوی میں قیام کے دوران میری موٹر سائیکل جو مجھے ہانو جان نے دس ہزار روپے میں لے کر دی تھی کا واسا کی LEW-5880 چوری ہو گئی۔میں ان دنوں حاجی اقبال کے پاس کام کرتا تھا۔دفتر سے گھر آیا تو گفتہ کی طبیعت خراب تھی وہ ان دنوں امید سے تھی۔اسی دن تاریخ 26-12-87 تھی تو میں نے موٹر سائیکل بجائے گیٹ کے اندر رکھنے کے باہر ہی رکھی اور اوپر جا کر گفتہ کو کہا کہ جلدی کرو تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے مگر جب میں نیچے آیا تو موٹر سائیکل غائب تھی۔میں نے اردگرد دیکھا مگر جب نہ ملی تو میں نواں کوٹ تھانہ گیا اور وہاں موٹر سائیکل چوری کی رپورٹ درج کروائی لیکن وہ موٹر سائیکل آج تک نہیں ملی۔

16اپریل۔بیٹی امینہ سحر کی پیدائش

رات گئے 16اپریل کو ہمارے گھر بیٹی پیدا ہوئی۔اس کا نام میری والدہ نے سحر رکھا اور گفتہ نے امینہ یوں اس کا نام امینہ سحر ہو گیا۔امینہ سحر غزالہ کلینک پونچھ روڈ پر واقعہ ہسپتال میں پیدا ہوئی۔اس دوران گفتہ کی بہن تحسین نے ہمارا بڑا ساتھ دیا جبکہ میری والدہ نے بھی میری بیٹی کو بہت پیار کیا۔میری

بہن نے سلامی کی اور بس۔ بوجہ امینہ سحر میری والدہ کا ہمارے گھر واقعہ گلشن راوی آنا جانا شروع ہو گیا اور میں نے امینہ سحر کو لے کر اپنے والدین کے گھر گیا جہاں انہوں نے اسے سلامی دی اور میرے بڑے بھائی تنویر مرحوم نے بھی اسے پیار کیا۔

گھر میں میرے ساتھ ہمیشہ یہ مسئلہ رہا کہ مجھے کم اہمیت دی جاتی تھی۔ حالانکہ میں نوید سے بڑا تھا۔ وہ سب کے سامنے Insult کر دیتا اور میرے والدین بھی اس کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دیتے اور شادی کے بعد تو ویسے بھی ان کو مجھ سے توقعات کم ہوگئی تھیں یوں نوید ان کے لئے اور بھی اہم ہو گیا تھا۔ نوید کا موقف تھا کہ بندے کو اپنی ذات میں خودغرض ہونا چاہئے۔ جب ہم جیل سے رہا ہوئے تو جہانگیر بدر دو تین مرتبہ ہمارے گھر آئے اور اس نے کہا کہ میں نوید کی کتاب ''خدا کی تلاش میں'' کو اچھے داموں فروخت کروا دوں گا۔ اگر وہ میرے ساتھ چلے اور اس نے میری مخالفت جاری رکھی تو اس کی اور ہم سب اہل خانہ کی قربانیاں پیپلز پارٹی کیلئے رائیگاں جائیں گی۔

محترمہ بے نظیر کی واپسی، لاہور سے کراچی کارواں

ضیاء دور میں بینظیر جلاوطنی ختم کر کے پاکستان آئی تو پیپلز پارٹی کی طرف سے گارڈ مقرر کیا گیا۔ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچے تو عوام کا جم غفیر استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ میرے پاس موٹر سائیکل تھی اور ہم بینظیر کے ٹرک کے پیچھے کچھوے کی رفتار سے چل رہے تھے اور ایک دم پیچھے سے ریلا آیا تو ہم سب موٹر سائیکل سوار گر گئے اور میری موٹر سائیکل رش میں نہ معلوم کہاں چلی گئی۔ بہر حال میں اور عمر فاروق ایک ایمبولینس میں بیٹھ گئے اور بینظیر کے ٹرک کے آگے چل پڑے۔ میں نے اپنی ہوش میں اتنا بڑا جلوس نہیں دیکھا تھا۔ یہ جلوس مینار پاکستان تک تقریباً آٹھ گھنٹوں تک پہنچا۔ راستہ میں پیپلز پارٹی کے کچھ کارکنوں نے امریکہ کے جھنڈے جلائے تو بینظیر سے اس کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ جنہوں نے امریکہ کے جھنڈوں کو آگ لگائی ہے ہم سے نہیں۔ یوں کارکن حیران ہو گئے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ کیونکہ ان کا خیال تک کہ بھٹو کو سزائے موت میں امریکہ کا ہاتھ تھا۔ بہر حال بینظیر کے اسی بیان سے کارکن سخت مایوس ہوئے جب جلوس مینار پاکستان پہنچا تو میری ایک امریکن رپورٹر سے بات ہوئی جس نے مجھے کہا It is a Mamnoth crowd مینار پاکستان میرا بھائی تنویر بھی گیا ہوا تھا وہ وہاں بے ہوش ہو گیا تو پیپلز پارٹی کے کارکن اسے لے کر گھر آئے۔ مینار پاکستان بینظیر کی تقریر بہت جذباتی تھی اور وہ بار بار کہہ رہی تھی ضیاء جاوے جاوے شاید اسے اس بارے میں کوئی اشارہ مل چکا تھا کہ تم پاکستان واپس جاؤ اور ضیاء الحق نہیں رہے گا۔

بینظیر جب پاکستان واپس آئی تو لاہور میں اس نے اپنا سیاسی سرگرمیوں کا مرکز صالح فیصل حیات کے گھر گلبرگ بنایا جبکہ وہ انہیں بیگم نادرہ خاکوانی کے گھر یعنی رات وہاں بسر کرتیں۔ میں چونکہ

اس وقت ان کے گارڈز میں شامل تھا تو ہم ایک مرتبہ صبح کے وقت اس سے پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر اسرار جو کہ سٹوڈنٹ لیڈر تھے اور دیگر لیڈران نے اس سے ایک الگ ملاقاتیں کیں تو مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ نوید کیوں نہیں مل رہا تو میں نے نوید کو گھر فون کیا کہ تم ملاقات کرو سب تمہارے دوست بینظیر سے مل رہے ہیں تو اس نے کہا کہ مجھے بینظیر خود بلائے گی تو ملوں گا، بلکہ اس کو اس بات کا سخت غصہ تھا کہ میں بینظیر کا گارڈ کیوں بنا وہ کہتا تھا کہ اتنی قربانیوں کے بعد اگر گارڈ ہی بننا تھا تو کیا فائدہ۔ بینظیر کو جہانگیر بدر اینڈ گروپ نے آغا نوید کے بارے میں بہت بدظن کیا ہوا تھا۔

ضیاء بھی مارے تم بھی مارو

ہائے بیچارو ہائے بیچارو

ایک مرتبہ صالح فیصل حیات کی کوٹھی کارکنوں کا بہت رش تھا اور وہ گیٹ کے باہر جمع تھے ۔ جب جہانگیر بدر گزرنے لگا تو ورکرز کا ہجوم بھی ساتھ آ گیا تو جہانگیر بدر نے ہم لوگوں کو کہا کہ انہیں روکو تو نوید بھی وہیں کھڑا تھا۔ اسنے کہا کہ ہم تمہارے ملازم ہیں کہ انہیں روکیں تو بدر جلد از جلد قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر کمرے میں بینظیر بھٹو پارٹی لیڈران سے ملاقات کر رہی تھی تو باہر وہ تمام کارکن اکٹھے ہو گئے جنہوں نے قیدیں کاٹی تھیں اور کوڑے کھائے تھے۔ وہ پاکستان کے دور دراز علاقوں سے آئے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں بینظیر وقت دے۔ جب انہیں بےنظیر سے ملاقات سے روکا تو انہوں نے صالح فیصل حیات کی کوٹھی کے پچھلے لان سے شور شرابہ شروع کر دیا اور جہاں بینظیر بیٹھی تھی اس کے دروازوں کو پیٹنا شروع کر دیا اس پر صالح فیصل حیات اور بدر کے گارڈ نے ان کارکنوں کو مارنا شروع کر دیا اور کارکنوں نے نعرے بازی شروع کر دی کہ ضیاء بھی مارے تم بھی مارو ہائے بیچارو ہائے بیچارو ۔ یہاں بیچارو سے مراد وہ امیر لوگ تھے جو بینظیر کی آمد پر اپنی مالی حیثیت کے اعتبار سے پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ اس شور شرابے کو سن کر بینظیر چھت پر نمودار ہوئیں تو کارکنوں نے آغا نوید کو کندھوں پر اٹھا لیا اور بینظیر نے اسے کہا کہ یہ کوئی طریقہ نہیں آپ اپنا نمائندہ آغا نوید اندر بھیجیں تو میں اس سے بات کروں گی میرے والد مرحوم آغا عصمت بھی وہیں تھے۔

وہ بھی میز پر چڑھ گئے اور انہوں نے نوید کو خاموش کرواتے ہوئے خود بینظیر سے بات کرنے لگے نوید کو اس بات کا سخت افسوس ہوا کہ والد مرحوم نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا اور اس نے ان سے کہا کہ ابا جی تُسی ساری گیم خراب کر دیتی اے سنا ہے اس سارے ہنگامے کی فلم بی بی سی نے چلائی

تھی۔

جب بینظیر واپس ڈرائنگ روم میں چلی گئیں تو تھوڑی دیر بعد اندر سے پیغام آیا کہ آغا نوید سے بینظیر ملاقات کرنا چاہتی ہے تو سب کارکنوں نے نوید زندہ باد کے نعرے لگائے اور میں اسے کندھوں پر اٹھاتا ہوا دروازے تک لے گیا اور نوید اندر چلا گیا۔ نوید دس یا پندرہ منٹ کے بعد باہر آیا تو سب منتظر تھے کہ سنیں کہ کیا بات ہوئی؟ نوید بتایا کہ مجھے بینظیر نے کہا کہ میرے پاس پانچ منٹ ہیں آپ نے جو بات کرنی ہے کرلیں تو نوید یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ یہ پانچ منٹ آپ کسی اور کو دے دیں۔

پیپلز پارٹی کے حوالے سے ہماری قربانیوں کا ذکر بہت ہوا مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہی رہا اور عملی مظاہرہ بینظیر کے دونوں ادوار میں نہ ہوا۔ پیپلز پارٹی کے سرگرم کارکنوں میں سے ایک خاتون میری بہت عزت کرتی تھی اور مجھے پیپلز پارٹی کے مختلف جلسوں پر لے کر جاتی تو ایک مرتبہ ''بھٹو لورز'' کے روح رواں زیدی صاحب جن کی رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن تھی مجھے لے گئیں تو وہاں جب لیڈران تقریر کر رہے تھے تو میر نے مائیک پر اعلان کیا کہ اب پیپلز پارٹی کے نامور کارکن جن کی قربانیوں کا ذکر آپ کو جگہ جگہ ملے گا آپ سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میرے لئے یہ اعلان غیر متوقع تھا کیونکہ میں نے آج تک کبھی تقریر نہیں کی تھی تو میں بہت مشکل سے سٹیج پر پہنچا اور مائیک میں صرف یہ کہہ سکا کہ بینظیر صاحبہ آرہی ہیں ان کا استقبال والہانہ طریقہ سے کریں اور اس کے بعد میں گم سم ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری لاتیں کانپ رہی ہیں اور میں گر جاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں واپس اپنی جگہ آ گیا بعد میں، میں نے میر سے کہا میں نے کبھی بھی تقریر نہیں کی اور تم نے مجھے سٹیج پر بلا کر بہت زیادتی کی۔

بے نظیر کا کارواں لاہور سے کراچی تک

ہم نے پروگرام بنایا کہ ہم لاہور سے کراچی تک بینظیر کے ساتھ جلسوں، جلوسوں میں جائیں گے۔ قدیر کھوکھر کے پاس وقت بالکل نئی سوزوکی آلٹو تھی۔ جب بینظیر کا 2 مئی کو ملتان میں جلسہ تھا تو ہم ایک رات پہلے چاروں ملتان پہنچ گئے اور وہاں ایک ہوٹل قیام کیا۔ اس قیام وطعام کا سارا خرچہ قدیر کھوکھر کر رہا تھا۔ اس نے جیل سے رہائی کے بعد مالی لحاظ سے بہت ترقی کی اور اب وہ کروڑوں پتی ہے۔ میں اور قدیر الگ کمرے میں ٹھہرے اور دونوں خواتین الگ کمرے میں۔

17 اگست 1987 ضیاء الحق طیارہ حادثہ

17 اگست 1987ء کو بہاولپور کے مقام پر ضیاء الحق کا طیارہ C-130 سے گر کر تباہ ہو گیا۔ یہ

خبر سن کر ہم سب گھر والوں کو بہت خوشی ہوئی۔ ان دنوں ہم لوگ مسلم کالونی رہتے تھے ہمیں اس خبر کی تصدیق ندیم نے بھی ڈنمارک سے فون کر کے بتائی، اگرچہ ہم سب خوش تو تھے مگر ایک انجانا خوف بھی کہ اب ہم سب گھر والوں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی تو اس سے بچنے کے لئے وہ رات میں نے اپنے دوست سلیم کے گھر گزاری، لیکن آہستہ آہستہ یہ گرفتاری کا خوف جاتا رہا۔ خطرہ تھا کہ مارشل لاء لگے گا، مگر صدر اسحاق نے الیکشن کا اعلان کر کے ہم سب کو حیران کر دیا اور ہم سب گھر والوں کو ایک بھر پور مصروفیت کا موقع مل گیا۔

ملتان میں بے نظیر نون ہاؤس ٹھہریں تو گیٹ پر ہمارا دوست غلام عباس بھی تھا جس نے ہمیں طریقہ سے نون ہاؤس بینظیر کے کمرہ میں داخل کروا دیا قدیر کھوکھر نے۔

پہلے سے بریف کر دیا تھا کہ تم بینظیر سے میری بہت تعریف کرنا میں چونکہ اس کا احسان مند تھا کہ وہ مجھے اتنی جگہوں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے تو میں نے بینظیر سے اپنے بارے میں کم اور قدیر کھوکھر کے بارے میں زیادہ باتیں کیں۔ اس وقت بینظیر کے پاس بہت زیادہ سندھی اجرکیں اکٹھی ہوئی تھیں تو انہوں نے ایک اجرک قدیر کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تمہاری بیوی کے لئے میری طرف سے تحفہ۔ قدیر کھوکھر اجرک لے کر بہت خوش ہوا اور باہر آ کر سب کو بتایا کہ بینظیر نے اسے یہ اجرک تحفتاً دی ہے۔

آغا نوید کی انتخابی مہم

میرے بھائی آغا نوید کو شیخ رشید سینٹر چیئر مین پیپلز پارٹی نے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا کیونکہ بینظیر بھٹو نے اس کا فیصلہ شیخ رشید پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے حلقے کے دونوں صوبائی اسمبلی کے امیدوارں کو ٹکٹ وہ خود دیں تو انہوں نے آغا نوید کو حلقہ 128 اور عبدالقادر کو حلقہ 129 کا ٹکٹ دیا، جبکہ نوید کے مدمقابل اختر رسول مسلم لیگ کے صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے۔ ہم کرایہ کے گھر میں رہتے تھے اور مالی حالت بھی بہت ناگفتہ بہ تھی تو اس موقع پر میرے تایا کے بیٹے اسیم بٹ نے نوید کا بہت ساتھ دیا اور میں بھی نوید کی الیکشن مہم میں زبردست مصروف ہو گیا۔ ہمارے پاس مالی وسائل تو نہیں تھے مگر ہم دن رات الیکشن مہم چلا رہے تھے۔ انہی دنوں قیوم نظامی جو کہ عرصہ آٹھ سال سے لندن جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا لندن سے واپس آ گیا۔ اسے شیخ رشید نے سنا ہے لندن سے لایا تھا اور اس میں شیخ رشید کی بیوی کا عمل دخل بھی زیادہ تھا۔ شیخ رشید کی بیوی جو اپوا کالج میں پرنسپل تھی اس کا خیال تھا کہ نوید مالی طور پر

کمزور ہے اور شیخ صاحب بھی اتنے مالدار نہیں تو کوئی ایسا امیدوار ہونا چاہئے کہ شیخ رشید کو مالی اعانت کرنے اور اس کا ذمہ قیوم نظامی نے اٹھالیا تھا کہ وہ اپنا اور شیخ رشید کے الیکشن خرچہ خود کرے گا۔

سمن آباد پونچھ روڈ میں الیکشن مہم کے دوران ایک جلسہ ہوا۔ جس میں قیوم نظامی نے بھی تقریر کی مگر نوید کی تقریر بہت جاندار تھی اور جلسہ میں شریک لوگوں نے نوید کو بہت داد دی جبکہ اس جلسہ میں قیوم نظام کی تقریر واجبی تھی اور اس کا تاثر سامعین پر کچھ اچھا نہ تھا۔ جس دن کاغذات نامزدگی جمع کروانے تھے تو اسیم بٹ میرا تایا زاد بھائی چار پانچ شورومز سے سینکڑوں کی تعداد میں گاڑیاں لے آیا ۔تو یہ ایک بہت بڑا جلوس بن گیا۔ نوید نے اپنے سارے حلقے کا دورہ کیا تو لوگ بہت متاثر ہوئے اور وہ واقعی بڑا جلوس تھا۔ عبدالقادر کی خواہش بھی تھی کہ یہ جلوس اس کے حلقے سے گزرے مگر نوید نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور عبدالقادر کا جلوس نکل گیا کیونکہ نوید کے الگ ہونے سے اس کے جلوس کی تعداد بہت کم رہ گئی اور عبدالقادر نوید سے سخت بدظن ہو گیا۔ کاغذات نامزد میں جمع کرواتے وقت سیشن کورٹ کے باہر مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے جلوسوں میں سخت ہنگامہ آرائی ہوئی اور اینٹوں اور فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔

انچارج حاجی اصغر گھرکی کی الیکشن مہم رائونڈ

نوید کے کاغذات نامزدگی داخل ہونے کے بعد اختر رسول کی طرف سے اعتراض اٹھایا گیا کہ نوید نے کچھ عرصہ پہلے سرکاری ملازمت کی ہے۔ اس لئے وہ الیکشن نہیں لڑسکتا یوں اس کے کاغذات نامزدگی مسترد ہو گئے اور وہ الیکشن لڑنے سے Disqualified ہو گیا۔ سیکنڈ نمبر پر چونکہ قیوم نظامی نے بھی کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے تو اس کو الیکشن لڑنے کا مجاز قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس پر کافی مقدمات تھے اور توقع تھی کہ وہ بھی Disqualified ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس الیکشن میں رشیخ رشید اور قیوم نظامی دونوں اپنے مدمقابل مسلم لیگیوں سے ہار گئے جبکہ عبدالقادر جیت گیا۔

جب نوید الیکشن لڑنے سے Disqualified ہوا تو ہمارے گھر واقع مسلم کالونی حاجی اصغر جو کہ اب پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے اور انہوں نے میرے والد مرحوم کو اپنی دیرینہ دوستی کے حوالے سے کہا کہ نوید اور مبین کو میری الیکشن مہم میں حصہ لینے کے لئے بھیجا جائے۔ تو نوید نے اتنا حصہ تو نہ لیا البتہ میں حاجی اصغر مرحوم کی الیکشن مہم میں جیت گیا اور جب تک الیکشن ختم نہ ہوئے رائیونڈ رہا۔ رائیونڈ میرے ساتھ آصف گھرکی اور عابد کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے۔ ہم نے رائیونڈ

میں حاجی لیاقت کے مکان میں ایک کمرہ لے لیا اور وہاں انور گھر کی اور کرامت وغیرہ نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ رائیونڈ میونسپل کمیٹی کے دفتر کے قریب ہمارے کچھ بینرز مسلم لیگیوں نے پھاڑ دیئے تو آصف گھرکی نے وہاں چوراہے میں کھڑے ہو کر سب کو للکارا کہ جس نے آئندہ ایسا کیا تو اس کی خیر نہیں۔ آصف گھرکی کا رویہ سیاسی نہیں بدمعاشی تھا اور اس سے بہت سے لوگ ناراض بھی ہو گئے۔

ایک مرتبہ حاجی اصغر گھرکی مرحوم اور میں رائیونڈ سے واپس آ رہے تھے تو حاجی صاحب نے پوچھا کہ الیکشن میں ہماری پوزیشن کیسی ہے؟ تو میں نے بتایا کہ آپ کی بوجہ آپ کے رفاہی کاموں حاجی صاحب ضیاء الحق کے دور میں ہونے والے غیر سیاسی انتخابات میں بھی ممبر قومی اسمبلی رہ چکے تھے۔ آرائیں برادری اور پیپلز پارٹی کے ووٹ بینک کی وجہ سے پوزیشن بہت اچھی ہے اس طرح انہیں میری بات سے کافی اطمینان ہوا۔

حاجی اصغر مرحوم کی الیکشن مہم کے آخری دنوں میں بینظیر نے سارے پاکستان کا دورہ بذریعہ ٹرین کیا اور جب وہ رائیونڈ جنکشن پہنچی تو میں نے حاجی اصغر گھرکی کو کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا تو بے نظیر نے کہا کہ اچھا یہ ہیں حاجی صاحب۔

گورنر ہاؤس لاہور ایک تقریب تھی جس میں ان سب قیدیوں کو مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے ضیاء دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ یہ اصل میں ٹی پارٹی تھی جو کہ گورنر ٹکا نے کارکنوں کو خوش کرنے کے لئے دی تھی۔ اس میں پیپلز پارٹی کے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی بھی مدعو تھے لیکن ان کی حیثیت بظاہر اس ثانوی تھی۔ اس تقریب میں بڑی ہنگامہ آرائی ہوئی اور فوجی افسران کو سٹیج سے نیچے اتار دیا گیا۔ یہ بات گورنر ٹکا کے لئے سخت پریشانی کا باعث بنی اور انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ اسی تقریب میں میجر شاہد بھی تھا جس نے ہمارے اہل خانہ کو بوجہ تفتیش بہت تنگ بلکہ بہت ظلم کیا تھا۔ اس کے پاس ہماری ایک راڈو گھڑی بھی تھی جو اس نے کبھی واپس نہیں کی۔ حاجی اصغر گھرکی مرحوم بھی اس پارٹی میں شامل تھے اور اس کے اختتام پر وہ میرے پاس آئے اور مجھے کہا تم ناراض ہو چلو میرے ساتھ اور میں ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ان کی رہائش گاہ 16- ایف سی سی چلا گیا اور پھر میری ناراضی ختم ہو گئی۔

الیکشن والے دن میں الصبح اٹھ کر ہمارے جتنے بھی پولنگ ایجنٹ تھے۔ ان کے گھر تمام پیپرز پہنچائے اور ساتھ میں کچھ رقم بھی تا کہ اگر کوئی ووٹ چیلنج کرنا پڑے تو اس کی فیس دے کر چیلنج کر سکیں۔

میں دوران پولنگ مختلف بوتھوں کا دورہ کرتا اور جہاں ہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ پہنچاتا۔لنچ کے لئے پولنگ ایجنٹس کے لئے قیمے والے نان اور دہی تھی۔ وہاں میری ملاقات رابعہ نامی لڑکی سے ہوئی جس نے بےلوث ہوکر پولنگ والے دن کام کیا۔میری اس سے بعد میں واقفیت ہوگئی۔ اس کے علاوہ اماں بشراں نے بھی انتھک محنت کی۔ وہ روز صبح میری خواتین کا ایک گروپ لے کر علاقہ سے دوسرے علاقہ مہم کے لئے جاتی اور رات کے لئے واپسی پر ہمیں رپورٹ کرتی کہ وہ ان ان علاقوں میں گھر گھر ہو آئی ہے۔ان سب کی انتھک محنتوں کی وجہ سے حاجی اصغر مرحوم الیکشن جیت گئے۔ان کے مدمقابل وزیر علی بھٹی تھا جو سنا ہے کبھی حاجی اصغر مرحوم کا بہت دوست تھا۔ اس الیکشن میں چودھری ذوالفقار نے بھی حاجی اصغر مرحوم کی الیکشن مہم میں بھرپور حصہ لیا اور ان کے حق میں تقاریر کیں۔اس الیکشن میں پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی لیکن پنجاب میں وہ صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکے۔ یوں پنجاب میں میاں نواز شریف کی حکومت بن گئی۔قومی اسمبلی کے انتخابات میں شکست کے بعد صوبائی اسمبلی کے الیکشن جیتنے کے لئے مسلم لیگیوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا جاگ پنجابی جاگ تیری پگ نوں لگ گیا داغ اور اس نعرہ کا بھرپور فائدہ اٹھایا کیونکہ سندھ میں مسلم لیگ کو چند سیٹیں ملی تھیں۔ میں جب الیکشن مہم میں مصروف تھا تو گفتہ صدرا اپنے والد کے گھر میری بڑی بیٹی سحر کے ساتھ مقیم تھی۔

حاجی اصغر گھرکی مرحوم کی جیت کے بعد میرا ان کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور ان کے اہل خانہ نے خوب جشن منایا۔اسی سلسلے میں ایک محفل موسیقی ٹاؤن شپ واقع آصف گھرکی کے گھر منعقد ہوئی۔جس میں راقم نے بھی شرکت کی اس محفل موسیقی میں کئی نامی گلوکار نے غزلیں گائیں اور بہت داد پائی اور الصبح تک یہ سلسلہ جاری تھا۔سہیل گلوکار ہمارے گھر مسلم کالونی کے قریب پکی ٹھٹھی رہتا تھا تو ہم دونوں کو چھوڑنے مختار نامی ڈرائیور سمن آباد آ رہا تھا اور جب ہم سہیل کو اس کے گھر اتار چکے تو میرا ارادہ ہوا کہ میں صدرا اپنی بیوی کے پاس چلوں تو جب ہم بوہڑ والے چوک کے قریب پہنچے تو وہاں پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا انہوں نے ہمیں وہاں روک لیا اور جب گاڑی کی تلاشی لی تو ڈگی میں سے شراب کی بوتل ملی جو کہ ہمارے لئے مصیبت بن گئی اور پولیس والوں نے پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے تو ہم نے بتایا حاجی اصغر گھرکی کی کہ وہ اس سے مرغوب ہو کر ہمیں چھوڑ دیں گے تو انہوں نے کہا کہ وہ تو بہت بڑا اسمگلر ہے اور ہمیں سمن آباد تھانے لے آئے۔تھانے کے قریب پہنچ کر انہوں نے کہا کہ اگر اخبار میں یہ خبر آئی کہ آغا

مبین سے شراب برآمد ہوئی ہے تو کتنی بے عزتی ہوگی تو بہتر ہے کہ تم کچھ لے دے کر جان چھڑاؤ۔ پیسے کو ہمیشہ میری سے دشمنی رہی ہے اور اسی وقت میرے پاس صرف دو روپے تھے تو میں نے انہیں کہا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں تو کہنے لگے کہ پھر تھانے چلو میں گھبرا گیا اور مجھے خیال کیوں نہ ایک آدھ جاننے والے سے رقم مانگی جائے تو میں جناح کالونی صوفی جو کہ گھر کی لوگوں کا بھی جاننے والا تھا اس کے گھر گئے اس وقت پولیس کے آدمی ہمارے پاس گاڑی میں ہی موجود تھے تو صوفی نے صاف انکار کر دیا بلکہ وہ پولیس کو دیکھ کر فوراً اندر چلا گیا۔ میں بہت پریشان ہوا اور پولیس والوں نے کہا کہ اب تھانے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور ہم تھانے کی طرف جارہے تھے کہ مجھے فوراً سہیل کا خیال آیا اور میں نے مختیار کو کہا کہ سہیل کے گھر چلو۔ وہ اپنی سونے کی تیاری کررہا تھا کہ میں نے اسے گھنٹی بجا کر بلا لیا تو اسے سارا ماجرہ سنایا تو اس نے ہمیں تین ہزار روپے دیئے اور پولیس کو یہ رقم دے کر ہم نے جان بچائی۔ مختیار نے جب یہ واقعہ گھر کی لوگوں کو بتایا تو انہوں نے اسے زدوکوب کیا کہ تم خود مبین سے مل کر شراب پی گئے ہو اور اب جھوٹ بولتے ہو تو اس نے کہا کہ آپ تھانے سے معلوم کرلیں اور انہیں اس بات کا علم ہو گیا اور سنا ہے کہ انہوں نے پولیس سے رقم واپس لے کر سہیل کو دے دی۔ جب اس بات کا پتہ چلا تو میں نے حاجی اصغر گھرکی کے گھر جانا بند کر دیا اور مجھے سخت افسوس ہوا۔

پرائم منسٹر بے نظیر صاحبہ سے ملاقات بتاریخ دسمبر 1988

پیپلز پارٹی کے الیکشن جیتنے کے بعد ہماری سب اہل خانہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور امید تھی کہ اب ہماری سنی جائے گی اور ہم مالی طور پر مضبوط ہو جائیں گے۔ اس زمانے میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور میں دربدر ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ مالی حالت بھی ایسی ہوگئی تھی کہ سحر کو دودھ پلانا مشکل ہو رہا تھا تو اسی پریشانی میں، میں ایک دن فجر کے وقت وزیراعظم ہاؤس راولپنڈی پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں حاکم وقت بینظیر کو رقعہ بھیجوں گا تو وہ مجھے فوراً بلا لیں گی تو مجھے سکیورٹی والوں نے روک لیا۔ میں نے انہیں اپنا تعارف کروایا کہ میری پیپلز پارٹی کے لئے کتنی قربانیاں ہیں تو انہوں نے مجھے ایک رجسٹر دیا اور کہا کہ اس پر وجہ ملاقات لکھو تو میں نے دو تین مرتبہ یہ لکھ دیا کہ I want to talk to prime minister about and important matter

میرا خیال تھا کہ وہ یہ پڑھ کر مجھے فوراً بلا لیں گی اور میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ مجھے سکیورٹی والوں نے بتایا کہ آپ لاہور واپس جائیں اور آپ کو اگر وزیراعظم صاحبہ نے بلانا ہوا تو وہ آپ کو خود بلا لیں گی

اور میں وہاں حاجی اصغر مرحوم کی رہائش گاہ FCC-16 کا فون نمبر دے آیا کیونکہ گفتہ کے گھر اس وقت فون نہیں تھا اور والدین میرے سے ناراض تھے۔ مجھے راولپنڈی سے آئے ہوئے ابھی دو یا تین روز ہوئے ہوں گے تو گھر کی ہاؤس فون آیا کہ وزیراعظم صاحبہ آغا مبین کو ملاقات کے لئے بلا رہی ہیں تو یہ پیغام مجھے صوفی نے گفتہ کے گھر پہنچایا کہ میں کل صبح 8 بجے وزیراعظم ہاؤس پہنچ جاؤں۔ میں نے کرایہ وغیرہ ایک دوست سے لیا اور اگلے دن الصبح راولپنڈی پہنچ گیا۔ جب پرائم منسٹر ہاؤس پہنچا تو میں نے گیٹ پر کھڑے سکیورٹی والے کو کہا کہ مجھے وزیراعظم صاحبہ نے مدعو کیا ہے تو اس نے مجھے کہا کہ آپ کا ملاقاتیوں کی لسٹ میں نام نہیں ہے مجھے بڑی مایوسی ہوئی لیکن فوراً اس نے کاغذ کی پشت کی طرف دیکھا تو وہاں میرا نام تھا اور اس نے مجھے اندر بھیج دیا۔ میں ایک عالی شان عمارت میں دور تک پیدل چلتا رہا اور ایک صحن میں جہاں کچھ کرسیاں لگی تھیں مجھے بٹھا دیا گیا اور مجھے چائے پیش کی گئی۔ وہاں میں شیخ رشید سے ملا جو کہ کسی ضروری کام کے لئے بلائے گئے تھے۔

کچھ دیر انتظار کے بعد ایک صاحب باوردی میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا آپ یہاں بیٹھے ہیں اندر چلیں وزیراعظم صاحبہ ملاقات کے لئے آنے والی ہیں تو میں ایک بڑے ہال میں جہاں یوشکل میں کرسیاں لگی تھیں دائیں ہاتھ پانچویں نمبر والی کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ وہاں ناہید خاں اور صفدر عباسی بھی تھے۔ وزیراعظم صاحبہ نے ملاقات کا سلسلہ بائیں جانب سے شروع کیا اور پہلے ملاقاتی کوئی مولانا صاحب تھے۔ انہوں نے وزیراعظم صاحبہ کو کوئی قیمتی تحفہ پیش کیا اور مبارکباد دی۔ اسی دوران بعد میں کوئی۔ سردار صاحب ملاقات میں شکایت کر رہے تھے کہ انہیں دھاندلی سے ان کے حریف نے الیکشن ہرایا ہے جب تک میری باری آئی کافی دیر ہو چکی تھی اور وزیراعظم صاحبہ نے کہا کہ آج انہیں اعتماد کا ووٹ لینا ہے اور وہ اسمبلی سے لیٹ ہو رہی ہیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے کہا کہ وزیراعظم صاحبہ میں آپ کے پاس نوکری حاصل کرنے حاضر ہوا تھا تو انہوں نے ناہید خاں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ انہیں اپنا مسئلہ بیان کریں اور چلی گئیں مجھے بڑا ملال ہوا کہ میری پوری بات بھی نہیں سنی اور چلی گئیں۔ یعنی بقول شاعر

؎ مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے رہے

بہرحال ناہید خاں اور صفدر عباسی نے میری درخواست برائے ملازمت رکھ لی اور مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اگرچہ جب میں وزیراعظم صاحبہ سے ملاقات کرنے

سے راولپنڈی جارہا تھا تو مجھے بہت سے لوگوں نے مشورہ دیا کہ کسٹم انسپکٹر کی جاب مانگنا۔اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔لیکن میں نے ناہید خاں اور صفدر عباسی کو کہا کہ یہ آپ پر منحصر ہے کہ مجھے جہاں چاہیں ملازمت دلوا دیں۔ میں انہیں کسٹم انسپکٹر کی جاب کا اس لئے بھی نہ کہہ سکا کہ وہ یہ نہ سوچ لیں کہ یہ پیسے بنانا چاہتا ہے اور کرپٹ ہے۔ہمیں بچپن میں ایک کہاوت سننے کو ملتی تھی۔اور یوں میں بے خیالی کر کے دودھ ملائی نہ کھا سکا۔

جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم
جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی

پاکستان سٹیل ملز ملازمت بتاریخ 16-04-1989

ایک ماہ بعد مجھے چیف ڈویلپمنٹ بیورو سے اس وقت کے وزیراعظم صاحبہ کے سپیشل اسسٹنٹ نصیراللہ بابر کی طرف سے لیٹر ملا کہ آپ کی ملازمت کے لئے آپ کی درخواست پاکستان سٹیل ملز بھیج دی گئی ہے اور تقریباً ایک ماہ بعد مجھے پاکستان سٹیل ملز کی طرف سے انٹرویو کے لئے لیٹر بھی مل گیا۔ میں انٹرویو کے لئے پاکستان سٹیل ملز پہنچا تو اس سے پہلے ہی مجھے ندیم کے ایک دوست حسینی اور اس کے کزن حیدر نے مجھے ریلوے سٹیشن وصول کیا اور میرے قیام کا بندوبست ایک ہوٹل میں کیا جو اپنی تعمیر میں کافی پرانا تھا۔ حسینی ڈنمارک میں میرے بھائیوں آغا ندیم، آغا ولید اور آغا وسیم کا دوست تھا۔ اس نے مجھے کراچی خوب سیر بھی کروائی اور کھانے وغیرہ کا انتظام اپنے گھر کیا جو موسیٰ لین رنچھوڑ لائن میں واقع تھا مجھے ان کے گھر والوں کی پکائی ہوئی مچھلی بہت پسند آئی۔

انٹرویو کی تاریخ سے ایک دن پہلے میں پاکستان سٹیل ملز پہنچا اور اس وقت کے جنرل منیجر شاہد ظفر سے ملا اور انہوں نے مجھے کہا کہ اتنے امیدواروں میں تم واحد ہو جس کا تعلق پنجاب سے ہے باقی سب اندرون سندھ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگلے دن جب میں انٹرویو کے لئے ہیڈ آفس پہنچا تو وہاں بڑی تعداد میں امیدوار تھے جو واقعی سندھی تھے جب مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو جنرل منیجر شاہد ظفر کے کمرے میں کیپٹن ہارون، مسز قیصر، صادق اور ہارون شامل تھے۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ سٹیل ملز سے پہلے کہاں کام کرتے رہے ہیں تو میں نے جواب دیا سٹیل ملزم سے پہلے میں جیل میں تھا تو وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے

پھر پوچھا آپ نے کہیں پہلے ملازمت کی ہے تو میں نے جواب دیا گلشن کارپٹ انڈسٹریز گلبرگ لاہور بحیثیت اسسٹنٹ پرچیزر تو صادق نے پوچھا آپ بتائیں کہ Earnst money کیا ہوتی ہے؟ تو شاہد ظفر نے کہا کہ اس نے تو پرائیویٹ کمپنی میں کام کیا ہے یہ سوال تو انہیں سے پوچھنا چاہئے جس نے گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں پرچیزر کی نوکری کی ہے اور صادق اپنا منہ لے کر بیٹھ گیا۔ شاہد ظفر نے کہا سوال جواب چھوڑو اور مبین سے جیل کے بارے میں پوچھتا میں تو انہیں جیل کے واقعات سناتا رہا اور ساری سلیکشن کمیٹی میرے واقعات غور سے سنتی رہی۔ بعدازاں مُجھے کمیٹی نے جونیئر آفیسر سلیکٹ کر لیا اور میری تقرری کا لیٹر مجھے مورخہ 89-3-29 مل گیا لیکن میری جوائنٹ 89-4-16 کو ہوئی اس تاخیر کی وجہ ڈاکٹر سومرو تھے جنہوں نے مجھے بلڈ پریشر کا مریض ڈکلیئر کر دیا اور مجھے کراچی میں سولہ دن تک بلڈ پریشر کا علاج کروانا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر سومرو نے میرے ساتھ زیادتی کی کیونکہ اس میں میرے اچھے خاصے پیسے لگ گئے اور مجھے میاں ناصر جو کہ میاں عبدالخالق مرحوم کے صاحب زادہ تھے ان سے بھی مبلغ پانچ صد لینا پڑا۔ وقار اور انہوں نے اس رقم کا ذکر میرے بڑے بھائی آغا ندیم سے بھی کیا۔

پاکستان سٹیل ملز

میری جوائننگ کے بعد میری پوسٹنگ A&P(P.B) سیکشن میں کر دی گئی۔ یہ دور بڑا پرآشوب اور ہنگامہ خیز تھا کیونکہ اس وقت دھڑا دھڑ بھرتیاں ہو رہی تھیں جو کہ پیپلز پارٹی کے منشور میں بھی تھا کہ وہ اقتدار میں آکر لوگوں کو ملازمتیں دے گی۔ یعنی بیروزگاری کا خاتمہ کریں گے۔

AP(P-B) کو جوائن کرنے پر سنٹرل ایڈمن میں بہت شور ہوا کہ ایک پنجابی افسر آ گیا ہے حالانکہ میں نے اس بات کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی کہ کون سندھی ہے اور کون پنجابی۔ لیکن میرے تجربات اور مشاہدات میں صوبائی عصبیت کا پہلو پہلی مرتبہ سامنے آیا۔ مہاجر، پنجابی اور سندھی دونوں کو ناپسند کرتے تھے مگر وہ پنجابی کو سندھی پر فوقیت دیتے۔ ان کی کوشش ہوئی کہ کوئی سندھی ان کے سیکشن میں نہ آئے بلکہ جب میں سٹاف کو مختلف محکموں میں پوسٹ کر رہا تھا تو مجھے مہاجر افسران منت کرتے کہ کسی سندھی کو میرے پاس پوسٹ نہ کریں۔ پلانٹ پر جہاں سخت کام ہوتا وہاں زیادہ تر پنجابی اور پٹھان تھے جبکہ کلریکل جابز میں مہاجر اکثریت میں تھے، بلکہ وہ اپنے کوٹہ سے بہت زیادہ تھے تقریباً ساٹھ فیصد اس لئے ان کی اجارہ داری تھی۔ مہاجروں کے بعد زیادہ تعداد پنجابیوں کی تھی اور وہ ذہانت میں بھی دوسرے

سے بہتر تھے، جبکہ مہاجر، سندھی اور پٹھان لکھنے پڑھنے میں واجبی تھے۔ لیکن جیسا کہ ایک سندھی افسر لاشاری جو کہ ہمارے ساتھ لان میں ٹینس کھیلتا تھا وہ بہت ذہین افسر تھا اور میں اس سے ذاتی طور پر بہت متاثر تھا۔ وہ ٹینس میں بھی سخت جان مارتا اور اس سے پوائنٹ لینا بہت مشکل ہوتا۔ صوبائیت کے جن کو جنرل ضیاء الحق مرحوم نے باہر نکالا اور اسے زبردست پرموٹ کیا۔ ہیروئن، کلاشنکوف اور صوبائیت اسی کے دور کی پیداوار تھیں اور بنانے والی اور پرموٹ کرنے والا بھی ضیاء الحق مرحوم تھا۔ یہ اس کا اکیلے کا کام تو نہیں ہوسکتا ظاہر ہے اس کی پوری ٹیم تھی جو کہ اس کام میں شریک تھی۔ اس نے کراچی اور حیدر آباد ایم کیو ایم کو مضبوط کیا تا کہ سندھ میں پیپلز پارٹی کے مقابل لا کھڑا کرے اور یہی ہوا۔ دراصل وہ سب سے بڑا حریف اپنے لئے پیپلز پارٹی کو سمجھتا تھا کیونکہ اس سے اس نے اقتدار اور ان کا لیڈر چھینا تھا اور اسے معلوم تھا کہ پیپلز پارٹی جو کہ چاروں صوبوں میں پاپولر تھی وہی اس کے وجود کے لئے خطرہ ہے اور اس نے اس پارٹی کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کا یہ کہنا کہ ہم نسلوں کی آبیاری کریں گے اور خود وہ اس کوچہ فانی سے کیسا غائب ہوا یہ ہم سب کے سامنے کی بات رہے۔ رہے نام اللہ کا۔

میرا سیکشن کے انچارج فیاض احمد تھے جو کہ بہت محنتی اور سکھانے والے آفیسر تھے۔ ٹیم کے انچارج اس وقت ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے جو کہ میری جوائننگ کے کچھ عرصہ بعد ریٹائرڈ ہو گئے وہ پروٹو کول کا بہت خیال رکھتے۔ میرے سیکشن میں میرے پاس کرسی اور ٹیبل نہیں تھی تو میں نے ان سے درخواست کی کہ میرے لئے اس کا انتظام کیا جائے تو انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ آپ قمر سندھو جو کہ ڈپٹی منیجر تھے کی ٹیبل کو شیئر کرلیں اور ان کے مدمقابل کرسی لے کر بیٹھ جائیں۔

شریف صاحب ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد قمر عباس ہمارے انچارج نے جو بڑے ملنسار اور فری فرینک قسم کے انسان تھے ان میں پروٹو کول نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا، چونکہ میں نے کبھی پہلے سرکاری ملازمت نہیں کی تھی۔ اس لئے مجھے دفتری معاملات کا علم نہیں تھا، مگر فیاض احمد نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ مجھے یاد ہے فائلوں کے ساتھ فلیگ لگا ہوتا تھا تو اس پر پی یو سی وغیرہ لکھا ہوتا تو تو مجھے سب سے پہلے انہوں نے بتایا کہ پی یو سی paper under considration کا مخفف ہے۔

جنرل منیجر شاہد ظفر بھی مجھ پر بہت مہربان تھے اور انہوں نے مجھے آفر کی کہ میں سوائے کام

کے کچھ نہیں تمہاری پوسٹنگ مارکیٹنگ میں کر دیں تو تمہیں فائدہ ہوگا میں نے انہیں کہا کہ آپ اگر ہو سکے تو باہر کے ملک کسی کورس پر بھیجیں تو انہوں نے کہا اس کے لئے تین سال ملازمت کا ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے مجھے ڈائریکٹر کے دفتر کے ساتھ منسلک ایک کمرہ دے دیا تاکہ میں وہاں سے نئے بھرتی ہونے والے ملازمین کو مختلف ڈیپارٹمنٹس میں پوسٹ کرسکوں۔ مجھے انہوں نے کہا کہ تم اپنے پاس کوئی خاتون اسسٹنٹ رکھ لو مگر میں نے معذرت کر لی اور اپنے ساتھ وکیل الرحمن جو کہ اسسٹنٹ تھا ساتھ رکھ لیا اور ایک لڑکا جو کہ ریٹرزشپ پر تھا اظہر کو اپنے ساتھ رکھ لیا میں نے تقریباً ہزار کے قریب ملازمین کو ان کی مرضی کے مطابق یعنی جہاں وہ چاہتے تھے وہیں پوسٹ کیا اور میں سب ورکرز کا ہر دلعزیز ہو گیا۔ پی بی سیکشن صرف ورکرز کو ڈیل کرتا تھا۔

میں کچھ عرصہ پنجاب ہوٹل واقع جامع کلاتھ مارکیٹ رہا۔ چند دنوں کے بعد مجھے سٹیل ٹاؤن منیجر ہوسٹل وہاں لاڑکانہ کے انجینئر قاضی بھی مقیم تھے۔ اس وقت سٹیل ملز کی خاکی یونیفارم تھی جو پہننا ضروری تھی۔ ہوسٹل کے دو کمرے کافی کشادہ اور کچن کے علاوہ ایک بڑا باتھ روم تھا ہم دونوں ناشتہ خود تیار کرتے اور سبزی بھی خود بناتے۔ میں نے کچھ عرصہ کے بعد ہوسٹل کا میس جائن کر لیا جہاں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا اور ہم سے پیسے بھی کچھ زیادہ نہ لئے جاتے۔ اتوار والے دن ناشتہ اور لنچ اکٹھا۔ ہمارے پاس ایک راجہ نامی سب انجینئر رہتا تھا اسے ٹینس کا بہت شوق تھا اور مجھے اکثر ترغیب دیتا کہ میں بھی ٹینس کلب کا ممبر بن جاؤں جو میں بن گیا اور میں نے اپنی تنخواہ میں سے سات سو کا ریکٹ خریدا اور بھی جب تک سٹیل ٹاؤن رہا ٹینس کھیلتا رہا۔

مجھے دفتر میں قمر محمود سندھو جو کہ ڈپٹی منیجر تھے اکثر کہتے کہ تمہاری اتنی اپروچ ہونے کے باوجود یہاں بحیثیت جونیئر آفسر ملازمت کی ہے جبکہ بہت سے دوسرے لوگ جنہوں نے پیپلز پارٹی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا وہ منیجر اور ڈپٹی منیجر بھرتی ہوئے ہیں تو تم بھی سفارش کروا کر منیجر پوسٹ لو۔ اس وقت سینکڑوں پارٹی کے مقرر کردہ چیئرمین کرنل شمیم الیاس تھے جو کہ جلاوطن تھے اور ضیاء دور میں انہیں کورٹ مارشل کی سزا سنائی گئی تھی (غیر حاضری میں) تو وہ بہت فیاض چیئرمین تھے تو میں نے انہیں درخواست دی کہ مجھے جونیئر آفیسر کی بجائے اسسٹنٹ منیجر رکھا جائے جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی۔

منیجنگ ڈائریکٹر کرنل الیاس شمیم سے ملاقات

میں منیجنگ ڈائریکٹر کرنل الیاس شمیم کے دفتر درخواست لے کر پہنچا اور ان کے آئی ایس او

مسعود سے کہا کہ مجھے ایم ڈی صاحب سے ملنا ہے تو اس نے کہا کہ وہ بہت مصروف ہیں نہیں مل سکتے تو میں نے اسے کہا کہ آپ انہیں بتائیں کہ آغا مبین ان سے ملنا چاہتا ہے اگر وہ بلالیں تو ٹھیک وگرنہ میں چلا جاؤں گا تو اس نے کافی پس وپیش کے بعد مانا اور اسی وقت وہاں سی بی اے کے جنرل سیکرٹری نعیم پہنچ گئے اور انہوں نے کہا کہ مبین کو اندر بھیجو تو جب میں اندر پہنچا تو کرنل الیاس شمیم ایم ڈی اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگے۔ وہ مجھ سے کافی دراز قد تھے ظاہر ہے میرے ہاتھ ان کے کندھوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے تو میں نے ان کی قمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا تو پیچھے سے پی ایس او مسعود میرا کمر کے گرد ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ آداب اور پروٹوکول کے خلاف تھا۔ میں ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا تو وہیں خاتمی جنرل منیجر پروٹوکول بھی بیٹھا ہوا تھا جب میں نے اپنی درخواست برائے اسسٹنٹ منیجر دی تو خاتمی کہنے لگا کہ خدا کا شکر کرو کہ تمہیں جونیئر آفیسر کی جاب ملی ہے تو نعیم نے انہیں روکا۔ خاتمی خود صرف انٹرمیڈیٹ تھا اور مزے کی بات ہے اس نے پاکستان سٹیل میں اپنے بیٹے فیصل کو بھی اسسٹنٹ منیجر بھرتی کروادیا حالانکہ وہ بھی انٹرمیڈیٹ تھا اور اس کے تقرر نامہ پر یہ تحریر تھا کہ He will pass his graduation with in due course of time میری درخواست پر ایم ڈی نے لکھا کہ Appoint him Assistant Manager not jo بول میں اپنی درخواست دینے کے تقریبات تین ماہ بعد اسسٹنٹ منیجر ہو گیا۔

راقم نے پاکستان سٹیل میں بہت محنت سے کام کیا اور سنٹرل ایڈمنسٹریشن میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ مجھے اٹلی میں منیجر بل کورس کے لئے نامزد بھی کیا گیا لیکن میں جا نہ سکا۔ اس کے علاوہ ایم ٹی سی میں ایک کورس جو کہ پانچ دن کا تھا گیا اور سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ ہمارا سیکشن کیونکہ ورکرز کو ڈیل کرتا تھا اور ورکرز کا بھی ہمارے سیکشن آنا جانا لگا رہتا تھا جس کی وجہ سے بہت رش رہتا۔ اس رش سے بچنے کے لئے ہمارے سیکشن کو ہیڈ آفس سے پلانٹ جسے روٹی پلانٹ کہتے تھے وہاں پہلے منزل پر منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے سیکشن کے مقابل ایس ایم ڈی تھا۔ وہاں اس پلانٹ کی وجہ سے Hazard تھا سٹیل کے چھوٹے چھوٹے ذرے ماری میزول پر گرد جمع ہو جاتے اور سانس کے ذریعے اندر چلے جاتے جو کہ صحت کے اعتبار سے بہت نقصان دہ تھے ہم نے مجاز افسران کو کئی مرتبہ باور کروایا کہ ہمیں پلانٹ سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے تو ہماری یہ کوشش بار آور ہوئی اور ہم بیرک نمبر آٹھ منتقل ہو گئے جو کہ ایک نسبتاً بہتر جگہ تھی۔

اپنے سیکشن میں میرے پاس سب سے زیادہ کام ہوتا اور اسی وجہ سے مجھے دو اسسٹنٹ شعیب خاں جو کہ پٹھان تھا اور صوابی کا رہنے والا تھا وہ اپنے والد کی ریٹائرمنٹ کے بعد سٹیل ملز سی بی اے معاہدہ کے تحت بھرتی ہوا تھا اور دوسری اسسٹنٹ مس لبنیٰ تھی۔ لبنیٰ بھی اپنے والد کی جگہ بھرتی ہوئی تھی مگر ان دونوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ مس لبنیٰ کے پاس میں نے فائل مارک کی تاکہ وہ مجھے پٹ اپ کرسکے لیکن وہ بھول گئی اور چھٹیوں پر چلی گئی۔ جب دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور کیس پٹ اپ نہ ہوا تو مجاز اتھارٹی نے معاملات کی تحقیق کا حکم دیا تو ذمہ داری مس لبنیٰ پر آگئی تو وہ رونے لگی میں نے اسے تسلی دی اور کہا تم فکر نہ کرو میں سنبھال لوں گا اور میں نے اپنے ذمہ معاملہ لے لیا اور مجھے اسی میں تنبیہ ملی۔

یونائیٹڈ ورکرز فرنٹ

جب پیپلز پارٹی کا دور تھا تو بھرتیاں زور وشور سے ہو رہی تھیں تو ایم کیو ایم کی حامی یافتہ سی بی اے ناراض تھی کہ پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھرتی کیا جا رہا ہے تو ہیڈ آفس میں میرے پاس کچھ فائلیں تھیں جن پر جنرل منیجر شاہد ظفر نے دستخط کرنے تھے تو ایم کیو ایم کے سرکردہ لیڈر حکیم نے مجھ سے وہ فائلیں مانگیں میرے انکار پر اس نے چھیننے کی کوشش کی تو میں نے مزاحمت کرتے ہوئے نہ دیں تو وہ فائلیں پھٹ گئی۔ ان فائلوں میں راولپنڈی کے کچھ افراد تھے جو بھرتی ہونے تھے اور راجہ شاہد ظفر اپنے علاقہ کے لوگوں کو اپنی سیٹ پکی کرنے کی خاطر دھڑا دھڑ بھرتی کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ریٹائرڈ بریگیڈیئر رشید کو ڈائریکٹر لگوایا تھا تاکہ وہ اس کے علاقہ کے لوگوں کو بھرتی کرے جب فائلیں نہ دیں تو ہیڈ آفس کے افسران کو معلوم ہو گیا تو انہوں نے بعد ازاں حکیم کو وارننگ دی۔

جن دنوں میں بیچلر ہوسٹل میں تھا تو اس دوران ایک رات کوئی اڑھائی بجے کے قریب میری بیوی گفتہ بمعہ بڑی بیٹی سحر آ گئی۔ میرے لئے ان کی یہ آمد غیر متوقع تھی تو میں قاضی کے ساتھ والے کمرے میں اکیلا رہتا تھا جبکہ قاضی اور شبیر دوسرے کمرے میں تھے تو مجھے ان کی آمد پر حیرانگی اور خوشی ہوئی۔ اس کے بعد نوشہرہ کے قاضی صاحب اپنے آبائی گاؤں جا رہے تھے تو انہوں نے مجھے کہا کہ ایف بلاک میں ان کے ایک دوست کا کوارٹر دو ماہ کیلئے خالی ہے تم وہاں رہ سکتے ہو تو ہم نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ اس فلیٹ میں جس کا مالک خورشید تھا نے ایک کمرہ بند رکھا ہوا تھا کیونکہ اس میں اس کا سامان تھا اور باقی جگہ ہم تینوں کے لئے کافی تھی۔ وہ کوارٹر بہت ہوادار تھا اور سٹیل ٹاؤن کی آخری حدود میں تھا۔ ایف بلاک میں سٹل کا آخری سٹاپ تھا جو کہ ہمارے کمرے کے بالکل سامنے اور بہت قریب تھا۔ اس طرح

ہمیں آمدورفت میں بہت آسانی تھی ایف بلاک کے قریب ہی ایک بڑا سا دھوبی گھاٹ تھا جہاں سے ہمیں کم داموں کپڑے دھلواتے۔

ہمیں یونیفارم دے دیا جاتا۔ یہ یونیفارم سب افسران کو اچھا لگا۔اور استری ہو کر مل جاتے۔

انچارج ارشد گھرکی الیکشن مہم

الیکشن جیتنے کے کچھ عرصہ بعد حاجی اصغر گھرکی کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی ان کو ان کے آبائی گاؤں گھرکی میں دفن کیا گیا جو باڈر کے بالکل قریب ہے۔ میں کراچی میں تھا کہ مجھے آصف گھرکی کا فون آیا کہ ارشد گھرکی کو حلقہ 99 کا ٹکٹ ملا ہے تو تم ضرور آؤ تو میں چھٹی لے کر لاہور رائیونڈ ارشد گھرکی کی انتخابی مہم چلانے آ گیا۔ میرے دفتر کے افسران کو پتہ تھا کہ میں کسی سلسلے میں لاہور جا رہا ہوں حالانکہ میرا انتخابی مہم میں حصہ لینا آفیسرز سروس رولز کے خلاف تھا اور میں یہ جانتے ہوئے بھی لاہور آ گیا۔ یہ انتخاب پیپلز پارٹی کے لئے بہت اہم اس لئے بھی تھا کہ جتنے بھی پنجاب میں بائے الیکشن ہوئے تھے پیپلز پارٹی وہ تمام ہار چکی تھی اور خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کا پنجاب میں ووٹ بینک ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس الیکشن مہم کا انچارج غلام مصطفی کھر کو بنایا گیا۔ حاجی اصغر گھرکی کے چالیسواں کے دن ایک ہجوم اس میں بہت سے لیڈران نے شرکت کی جس میں کھر، اعزاز احسن اور بہت سے لوگ تھے یوں چالیسیواں ایک جلسہ کی صورت اختیار کر گیا اس میں اعتزاز احسن کو تقریر جو کہ اس نے پنجابی میں کی اک دن بھٹو دا بہت پسند کی گئی کھر کی تقریر کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔

اس انتخابی مہم میں میرے ساتھ آصف گھرکی کے علاوہ عابد، ریاض، انور گھرکی وغیرہ شامل تھے۔اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کی ساری بڑی لیڈر شپ بھی اس میں ہمہ تن مصروف تھی۔ ہمارے ساتھ اس وقت کے ریلوے کے وزیر ظفر لغاری، اعتزاز احسن وغیرہ شامل تھے۔اس الیکشن میں، میں نے دن رات محنت کی اور نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ پولنگ سے ایک دن پہلے رائیونڈ ناہید خاں اور عابدہ ملک مرحوم آئیں تا کہ جائزہ لے سکیں کہ مہم کیسی جا رہی ہے۔ میں نے ناہید خاں کو مہم کے بارے میں تفصیل بتائی اور اس کی لیڈر پولنگ ایجنٹس سے میٹنگ بھی کروائی۔ عابد، ملک مرحوم نے مجھے کہا کہ بھلا یہ کل کا چھوکرہ کیسے انتظام کر سکتا ہے جو کہ میں نے کر کے دکھایا اور پولنگ والے دن ہمارے سب ایجنٹس بر وقت پہنچ گئے۔ارشد گھرکی کا مقابلہ چودھری ذوالفقار سے تھا جو بے شمار پیسہ لگا رہا تھا بلکہ مجھے

بذ ریعہ آصف گھر کی معلوم ہوا کہ ذوالفقار کھادلگا رہا ہے یعنی الیکشن جیتنے کے لئے پیسے بانٹ رہا ہے۔ آصف کا خیال تھا کہ ہم بھی ووٹ خریدیں مگر میں نے اس کی مخالفت کی کہ جس کو ہم پیسے دیں گے اس کا کیا یقین کہ وہ ہمیں اندر جا کر ووٹ دیتا ہے کہ نہیں اس طرح۔

پولنگ والے دن رائیونڈ ضلع کونسل کمیٹی کے دفتر اس وقت کے مسلم لیگ کے صوبائی ممبر نے الیکشن میں جعلی ووٹ بھگتانے کی کوشش کی تو ناہید خاں نے اسے تھپڑ مارا اور وہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا اور پولنگ کچھ دیر بند ہوگئی وہاں کمر بھی پہنچ گیا اور فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔

ایف سی سی گھر کی ہاؤس جشن کا سماں تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ میرا وہاں بہت چرچا ہو رہا تھا مگر میں سونیا کے گھر اسے چھوڑ کر تھکاوٹ کی وجہ سے دنیا و آخرت سے بے خبر سخت تھکاوٹ کے بعد سو رہا تھا۔ الیکشن کے ایک ہفتہ کے بعد میں کراچی آ گیا۔ اس ہفتہ آصف اور میں کافی دن تک مختلف جگہوں کی سیر کرتے رہے اور اسی دوران سونیا سے بھی ملاقات رہتی جو مجھ سے اس لئے بھی متاثر ہوئی کہ میں کراچی میں سرکاری ملازمت کرتے ہوئے بھی ارشد گھر کی کی مہم کے لئے آیا ہوں۔

پاکستان سٹیل ملز

جب میں کراچی پہنچا تو سی بی اے کے الیکشن ہو رہے تھے اور مجھے اس وقت کے سی بی اے چیئرمین برائے ایم کیو ایم خالد کے الفاظ یاد ہیں کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ سی بی اے کا یہ الیکشن بینظیر حلقہ 99 لاہور کا الیکشن نہ سمجھے جس میں پیپلز پارٹی حکومتی مشنری استعمال کر کے جیت گئی۔ حقیقت میں سنٹر میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور پنجاب میں مسلم لیگ کی تو دونوں حکومتوں نے اس میں حکومتی وسائل بھرپور استعمال کئے جو کہ پاکستان کی روایت ہے۔ اس الیکشن کے دوران بینظیر امید سے تھیں وگرنہ وہ ضرور اس مہم میں حصہ لیتی لیکن وہ ارشد گھر کی سے روز مہم کے بارے میں پوچھتی کیونکہ وہ اس الیکشن کو بہت اہمیت دے رہی تھیں۔

میں نے ایف بلاک میں رہتے ہوئے اپنے نام کوارٹر اپلائی کر رکھا تھا مگر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا منیجر حاجی بہت مکار تھا پنجابیوں کے خلاف تھا اس نے مجھے بہت چکر لگوائے تو کوارٹر الاٹ نہ کیا۔ تنگ آ کر ایک دن میں ایم ڈی کرنل شمیم الیاس صاحب کے پاس ان کی رہائش گاہ آشیانہ جو کہ گلشن حدید کی حدود کے شروع میں واقع تھی بروز اتوار ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے اندر بلا لیا اور کوکا کولا سے میری تواضع کی۔ میں نے انہیں اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تمہاری نظر میں کوئی کوارٹر

خالی ہے تو میں نے بتایا کہ L-25 میں ہے مگر وہاں بڑے افسران یعنی ڈائریکٹرز اور جنرل منیجر رہتے ہیں انہوں نے مجھے کہا کہ تم بھی افسر ہو اور اپنی چٹ پر یہ لکھ دیا کہ Allot him accommodation on top priority یوں مجھے جلد ہی L25-1 میں گراؤنڈ فلور پر ایک فلیٹ مل گیا۔اس کے تین کمرے تھے جو کہ کافی کشادہ تھے۔ان فلیٹوں کو L- type کہتے تھے ان کی شیب ایل ٹائپ تھی۔سٹیل ٹاؤن کا لے آؤٹ نقشہ ایک اطالوی خاتون نے بنایا تھا اور اس سٹیل ٹاؤن کی تعمیر روسیوں نے کی تھی۔اس کا نقشہ اور تعمیر نہایت عمدہ اور پائیدار تھے۔نہایت کشادہ سڑکیں، ہمارے فلیٹ کے باہر بالکونی تھی اور ساتھ ہی بڑا لان تھا۔فلیٹ کی پشت میں بھی بڑا لان تھا اور درخت ایستادہ تھے۔ اس فلیٹ کے اندر الماریاں تھیں جو کہ کافی بڑی تھیں ان الماریوں کے اوپر سٹور نما دراز تھے۔جب میں اس فلیٹ میں منتقل ہوا تو اس وقت وہاں جنرل منیجر تھے بریگیڈیئر سلطان تھے ڈائریکٹر ٹرانسپورٹ اور بعدازاں ڈائریکٹر میجر نادر، جنرل منیجر اسحاق خٹک اور بریگیڈیئر رشید ڈائریکٹر رہتے تھے۔یوں میں اکیلا اے ایم ان بڑے افسران کے درمیان تھا۔ L-25 کو بیچلر ہوسٹل سے ایک سٹیل کی جالیوں سے الگ کیا ہوا تھا اور وہاں 29 گھنٹے ایک سکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی رہتی سب مجھ پر شک کرتے تھے کہ میں افسران اعلیٰ کے درمیان رہتا ہوں۔

جبکہ کرنل الیاس شمیم ایم ڈی بنے تو انہوں نے افسران کو یونیفارم پہننا ضروری تھا اور سال میں فی افسر تین سفاری سوٹ ملتے۔ہم سب افسران لیوری ڈیپارٹمنٹ نام لکھوائے اور بعدازاں ہم ان سے رسید لیکر کراچی چلے جاتے جہاں مدینہ ٹیلرز ہمارا ماپ لیا جاتا اور ایک ہفتہ کی تاریخ کے بعد ہمیں یونیفارم دے دیا جاتا۔یہ یونیفارم سب افسران کو اچھا لگا۔

ایک مرتبہ جاوید اختر جو کہ پیپلز پارٹی کا سرگرم کارکن تھا اور اسے 25 سال سزا بھی ہوئی تھی جو بینظیر نے اپنے پہلے دور میں معاف کر دی تو وہ میرے پاس آیا۔جہانگیر بدر کا ڈی او لیٹر جس میں لکھا تھا کہ قابل رقعہ ہذا کو ہزار ٹن سکریپ دی جائے۔میں اور جاوید ایم ڈی الیاس شمیم کے پاس گئے اور انہیں ڈی او دکھایا تو کہنے لگے یہ کام تو چیئرمین منیجر بخاری شجاعت کر سکتے ہیں میں اس کا مجاز نہیں۔یوں جاوید اختر بہت مایوس ہوا کیونکہ وہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وہ اب سکریپ سے مالدار ہو جائے گا۔پیپلز پارٹی کا پہلا دور سٹیل ملز میں پرآشوب تھا اور ہر لیڈر کا رخ سٹیل ملز کی طرف تھا کہ وہاں سے کاروبار لے کر راتوں رات کروڑ پتی بن جائے۔

پیپلز پارٹی کے دور میں لاڑکانہ کے کافی بیروزگاروں کو سٹیل ملز میں روزگار دیا گیا ان میں ایک لڑکی مسرت ابرو بھی تھی وہ بڑی تیز طرار قسم کی لڑکی تھی۔ اس کی تقرری بحیثیت اے ایم ہوئی لیکن سننے میں آتا ہے کہ اس کی فائل شجاعت اور غوری جو کہ افسران کی کیٹگری کو ڈیل کرتے تھے غائب کر دی جنرل منیجر شاہد ظفر کے کہنے پر اور ایسی غائب ہوئی کہ نہ ملی۔ وہ میرے ساتھ اس وقت کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر رشید کے سامنے پیش ہوئی کہ اس کی فائل ڈھونڈی جائے تو رشید صاحب نے اسے کہا کہ ابھی میں آپ کے J-O کی تقرری کے آرڈر کر دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی آپ کو اے ایم کر دوں گا یوں اس بے چاری کو ملی بھگت سے نقصان پہنچایا گیا۔ میرا ایک دوست امداد حسین اس کا دلداہ تھا اور اسے ملنے کے لئے ہر قت بے چین رہتا۔ ایک مرتبہ ہم دونوں رشین مارکیٹ بیکری سے سامان خرید رہے تھے تو امداد حسین نے مسرت ابرو سے کہا کہ آپ کے گھر کی کھڑکی آج کھلی ہوئی تھی تو مسرت ابرو نے فوراً جواب دیا ہاں وہ آغا صاحب کے لئے کھلی تھی تمہارے لئے نہیں اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ایک مرتبہ جبار جو کہ آفیسر ایسولیشن کا عہدیدار تھا گاڑی میں سٹیل ٹاؤن جارہا تھا تو میں اور مسرت آفس سے لیٹ ہو گئے تھے اور ہماری بس چھوٹ گئی تھی تو جبار کے ساتھ اگلی سیٹ پر کوئی اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے مسرت کو کہا کہ آپ آگے میرے ساتھ بیٹھ جائیں تو اس نے جواب دیا کہ نہیں میں پیچھے آغا کے پاس بیٹھوں گی تو اسے مایوسی ہوئی اور وہ میری طرف غصہ سے دیکھنے لگا۔ کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد مسرت ابرو نے کسی بنکر سے شادی کر کے گھر بسا لیا۔

بینظیر کے دور اقتدار کے دوران میرا بڑا بھائی آغا ندیم ڈنمارک سے پاکستان آ گیا حالانکہ ڈنمارک حکومت نے اسے منع کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان کے علاوہ کسی بھی ملک جا سکتا ہے لیکن وطن کی محبت اور اس خیال سے کہ اتنی قربانیاں دیں میں کچھ مالی فائدہ اٹھایا جائے وہ پاکستان آ گیا۔ اسے بہت امیدیں تھیں کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں کوئی بڑا مالی فائدہ اٹھا کر کروڑوں پتی ہو جائے گا اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھا کیونکہ پیپلز پارٹی سے وابستگی کی وجہ سے اس نے کاروبار حتیٰ کہ جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ وہ کابل سے دو میزائل یا راکٹ لانچر بھی لیکر آیا تا کہ ضیاء الحق مرحوم کے جہاز کو نشانہ لگا سکے بلکہ ایک میزائل راولپنڈی سنا ہے چودھری اعظم، ارشد اعوان اور ندیم نے ضیاء الحق مرحوم کے جہاز کو داغا بھی مگر نشانہ چوک گیا اور ضیاء اور اس کی کابینہ کے افراد بچ گئے۔ اس کے علاوہ وہ لاہور ایئر پورٹ پر دھماکے کا ذمہ دار تھا جس میں کافی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ یہ سب باتیں اس نے ہمیں

اس زعم میں بتائی ہیں کہ وہ یہ بتا سکے کہ اس کا پیپلز پارٹی کے لئے کتنا بڑا Contribution تھا مگر حقیقت میں بینظیر بھٹو اور اس کے حواری الذوالفقار کے لوگوں کو اپنے لئے اتنا ہی خطرہ سمجھتے تھے جتنا جنرل ضیاء کو، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ انتہا پسند ہیں جبکہ بینظیر امریکہ سے سمجھوتہ کر کے آئی تھی کہ وہ ان لوگوں کو پارٹی سے باہر کریں گی جن کا تعلق لیفٹ ونگ سے ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا اور آغا ندیم کوئی بڑا مالی فائدہ پیپلز پارٹی کے دونوں ادوار میں نہ اٹھا سکا اور اسے مجبوراً واپس ڈنمارک نامراد جانا پڑا۔

قالین سپلائی ڈنمارک

میں نے جب سے پاکستان سٹیل جوائن کی مجھے اندازہ تھا کہ تنخواہ میں میرا گزارہ بمشکل ہے تو مجھے یہ مان ضرور تھا کہ میرے چار بھائی بیرون ملک تین ڈنمارک اور ایک جرمنی ہیں تو میں ان کے ساتھ مل کر ضرور کچھ کاروبار کر سکوں گا۔ کراچی میں ہمارے ایک عزیز ضمیر بٹ قالینوں کا کام کرتے تھے ان کی دوکان جس ہوٹل کے قریب بہت بڑے علاقہ میں مشتمل تھی جو کہ بعد میں کروڑوں روپے میں بکی۔ اس کی دوکان میں بہت اعلیٰ قسم کے قالین تھے کیونکہ ان کا آبائی کام ہی قالین سازی تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں آپ اسے قالین لے کر ڈنمارک اپنے بھائیوں کو بھیجنا چاہتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے بارہ عدد بہترین قسم کے قالین فی قالین قیمت پانچ ہزار ڈنمارک بھیجے۔ قالین بھیجنے سے پہلے میں نے ڈنمارک ندیم اور ولید سے بات کر لی تھی اور انہوں نے مجھے کہا کہ بھیج دو یوں کارگو کے ذریعے قالین دوسرے دن انہیں مل گئے۔ ضمیر بٹ نے کہا کہ اگر ہمارا یہ سلسلہ کامیاب ہو جاتا ہے تو تمہیں نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی، لیکن اس مصرعہ کے معیاد یہ نا تھی ہماری قسمت وہ وہاں قالین بیچ نہ سکے اور تحفتاً اپنے دوستوں کو دیتے رہے اور میری رقم جو تقریباً 65 ہزار تھی وہ مجھے دو تین ماہ بعد کبھی بیس ہزار اور کبھی پندرہ ہزار کی صورت میں واپس ملتی رہی۔ میں جب ڈنمارک ان کے فلیٹ پہنچا تو میرے بھیجے ہوئے تین عدد قالین ان کے فلیٹ میں سجے ہوئے تھے مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ انہوں نے اس کام کو سیریس نہیں لیا۔

اسلام آباد جہانگیر بدر سے ملاقات

سنٹرل ایڈمن شیخ عبدالخاق تھے انہیں معلوم تھا کہ میری پیپلز پارٹی میں بہت جان پہچان

ہے تو ان کا کورنگی میں کوئی پلاٹ تھا وہ پٹرول پمپ لگوانا چاہتا ہے تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کے جہانگیر بدر کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں تو میرا یہ کام کروا دیں کہ میرے پلاٹ کو پٹرول پمپ کے لئے Designate کروا دیں۔ میں نے حامی بھر لی اور اس نے ٹکٹ کٹوایا اور ہم دونوں بذریعہ جہاز اسلام آباد پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے کچھ دن ایم این اے ہوسٹل قیام کیا ارشد گھرکی کے کمرہ میں بعد میں وہاں سے پاکستان سٹیل کے دفتر گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا اور عبدالخالق اپنے کسی عزیز کے گھر آ گئے مجھے نظام الدین روڈ پر واقع سٹیل میل گیسٹ ہاؤس میں اس کمرے میں جگہ دی گئی جہاں کا اے سی خراب تھا۔

وہاں میرے ساتھ کچھ دن شیخ شاہد بھی ٹھہرا۔ میں اور عبدالخالق ہم شام کو جہانگیر بدر کی رہائش گاہ پہنچے تو اس نے ہمیں فوراً اندر بلا لیا اور چونکہ کھانے کا وقت تھا ہمیں کھانا کھلا یا میں نے اس عبدالخالق کا کام بتایا تو اس نے اس کی درخواست پر فوراً آرڈر کر دیئے تو عبدالخالق بہت خوش ہوا۔ جہانگیر بدر نے درخواست کے کونے پر C/o Agha Mobeen لکھ دیا۔ اسی دوران آغا ندیم بھی اسلام آباد پہنچ گیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ شیخ عبدالخالق سے کام کروانے کے پیسے لئے ہیں تو میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ پیپلز پارٹی کے جن افراد کو پتہ چلا کہ مبین نے پٹرول پمپ بدر سے آرڈر کروانا ہے تو سب یہ جانتے کہ میں نے ضرور عبدالخالق سے پیسے لئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا بعد میں ہم نے اسے پروسیس بھی کروایا اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ پٹرول پمپ بنا کہ نہیں جن دنوں ہم نے بدر سے آرڈر کروائے اس کی شاید ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی یا بازو پر چوٹ تھی وہ زخمی ضرور تھا۔

ایک مرتبہ میں حسنین علی اور جاوید اختر فرنٹیئر ہاؤس ٹھہرے ہوئے تھے تو حسنین علی وہاں کسی خاتون کو لے آیا جس کے ساتھ ایک پیاری سی بچی بھی تھی۔ وہ حسنین کے جاننے والوں میں سے تھے اور اس کا شوہر امریکہ گیا ہوا تھا وہ خاتون بہت خوبصورت تھی ہم نے اسے کھانا کھلایا اور حسنین نے مجھے اور جاوید کو کہا کہ تم بچی کو لے کر میرے لئے سگریٹ لے آؤ تو وہ خاتون اس کے ارادے جان گئی اور حسنین کو اس کی کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ بعد میں معلوم ہوا نہ حسنین لڑکی کی مدران لاء کو یہ کہہ کر ساتھ لایا تھا کہ وہ انہیں مارکیٹ لے کر جا رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ جائے گا۔ واپسی پر وہ خاتون حسنین پر برس رہی تھی اور فرنٹیئر ہاؤس کے گارڈز نے یہ سارا تماشا دیکھا اور اس کا چرچا سارے اسلام آباد سیاسی جلوس میں ہوا۔

پیدائش مہر مبین

میری دوسری بیٹی مہر مبین کراچی میڈی کیئر ہسپتال پیدا ہوئی اس کی تاریخ پیدائش بوقت آدھی رات دو بجے کے قریب ہے۔ جب پولی کلینک یہ معلوم ہوا کہ ڈلیوری ہونے والی ہے تو ہمیں سٹیل ملز کی ایمبولینس میں ڈال کر میڈی کیئر ہسپتال پہنچایا گیا۔ پیدائش کے دوسرے دن بعد ہسپتال والوں نے کہا کہ آپ گھر جا سکتی ہیں تو کرنل مہر دل جو کہ ہمارے بلاک میں ہمسایہ تھے ان کی بیگم اور ڈرائیور کے ساتھ ہم لوگوں مہر بہن کو گھر لے آئے۔ مہر کا نام مہر اس لئے رکھا کہ کرنل مہر دل کی بڑی بیٹی کا نام مہر تھا اور وہ بہت پیاری اور لائق بچی تھی۔ میرے والدین کو جب مہر کی ولادت کا پتہ چلا تو سنا ہے میرے والد مرحوم نے کہا کہ مبین کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بیٹی دے دی ہے اور اس پر اب کافی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ ہم مہر دل کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئے۔ مہر پیدائش کے وقت صحت مند و توانا تھی اور انگوٹھا چوستی رہتی تھی جو کہ اس کے نانا افضل خان نے اسے ڈرا کر چھڑوا دیا۔

والد محترم آغا عصمت اللہ کی وفات

مہر مبین ابھی چند ماہ کی تھی میں دفتر جانے کے لئے نہا رہا تھا کہ ہمارے گھر مسز مہر دل آئیں اور انہوں نے گفتہ کو بتایا کہ لاہور سے فون ہے۔ میں نہا کر باہر نکلا تو گفتہ نے مجھے بتایا کہ لاہور سے فون تھا اور میرے والد فوت ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں کچھ دیر تو گم سم ہو گیا۔ گفتہ نے مجھے حوصلہ دیا میں اپنے دفتر گیا اور وہاں چھٹی کے لئے اپلائی کیا۔ میرے جب کولیگز کو اس خبر کا علم ہوا تو انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے بینک سے پیسے نکلوائے کرایہ کے لئے اور پھر بھی پیسے کم پڑ رہے تھے تو میں نے نورا ے میمن جو کہ اس وقت میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہے تھے ادھار پیسے لئے اور ہمیں مہر دل نے اپنی گاڑی میں ایئرپورٹ چھڑوایا۔ ایئرپورٹ گفتہ، سحر، مہر اور راقم پہنچے تو ٹکٹ نہیں مل رہی تھی اس وقت شاہین ایئرلائنز، بھوجا اور ایروایشیاء نے سروس شروع نہیں کی تھی۔ بہت کوشش کے بعد ہم سول ایوی ایشن کے سینئر آفسر سے ملے جس نے ساڑھے تین بجے کی فلائٹ سے ہمیں لاہور کے لئے بورڈ کر دیا۔ ہم ساڑھے پانچ بجے کے قریب لاہور پہنچے تو جنازہ میانی صاحب کی طرف روانہ تھا۔ وہاں مجھے ایک بات مشاہدہ میں آئی کہ میں جب مسلم کالونی اپنے والدین کے گھر پہنچا تو میری گود میں سحر تھی اور تھوڑی دیر بعد میرا بڑا بھائی آغا ندیم اندر سے آیا کہ چلو جنازے میں شریک ہونے کے لئے گاڑی میں بیٹھو تو میری بڑی بیٹی سحر کبھی ندیم کو دیکھے اور کبھی مجھے دیکھے تو مجھے اس دن معلوم

ہوا کہ میری اور ندیم کی شکل میں واقعی مشابہت ہے۔ جنازہ ابھی پونچھ روڈ پر ہی تھا کہ میں وہاں پہنچ گیا اور جنازے کو کندھا دیتے ہوئے کلمہ شہادت کا ورد شروع کر دیا۔ جنازہ جب میانی صاحب پہنچا تو میرے تایا کے بیٹے گوشے نے جنازگاہ میں آواز بلند پوچھا کہ اگر آغا عصمت اللہ مرحوم نے کسی کا کوئی قرضہ دینا ہے تو بولے تاکہ دفنانے سے قبل وہ قرضہ ادا کر دیا جائے مگر جب کسی کی طرف جواب ملا تو ان کا آخری دیدار کروایا گیا تو مجھے وہ چہرہ نہیں بھولتا۔ چہرہ پر سکون اور دبدبہ عیاں ایسے معلوم ہوتا کہ کوئی بادشاہ حالات سے جنگ لڑتے لڑتے ابدی نیند سو گیا۔ میں اس وقت بے شمار رویا دھاڑیں مار مار کر جیسے کسی کو اس کے وجود سے الگ کیا جا رہا ہو پھر ہم نے اپنے آبائی قبرستان والد مرحوم کو دفن کر دیا گیا۔ اس طرح وہ باب ختم ہوا جو ہمارے ہونے کا جواز تھا اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے آمین ثم آمین۔

مجھے بعدازاں بتایا گیا کہ والد مرحوم نے رات پاکستان کا کرکٹ میچ دیکھا جو کہ پاکستان جیت گیا اور پاکستان کی جیت کی خوشی میں انہوں نے سری پائے کھا لئے جو کہ انہیں ڈاکٹر صاحبان نے بوجہ بلڈ پریشر سختی سے منع کیا ہوا تھا جبکہ والد مرحوم کو پہلے بھی دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد والد پسینہ سے شرابور ہو گئے اور با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھنے لگے اور میری والدہ صاحبہ کو کہا کہ یہ بستر لپیٹ لو میرے بھائی آغا ندیم اور آغا نوید والد صاحب کو گاڑی میں بیٹھا کر شیخ زشید ہسپتال کی طرف روانہ تھے کہ والد مرحوم نے کلمہ پڑھتے پڑھتے اپنی جان دے دی اور ندیم کے کندھے پر سر لٹکا دیا۔ والد مرحوم کے قل پر بہت لوگ اکٹھے ہوئے جس میں پیپلز پارٹی کے لیڈران بھی شامل تھے اور بینظیر کی طرف سے ایم ڈی خاں افسوس کے لئے آئے۔ ہفتہ لاہور قیام کرنے کے بعد میں کراچی واپس آ گیا جبکہ گفتہ، سحر اور مہر وہیں رہیں۔

کیونکہ میں باہر سے یا دفتر سے ہی کھانا کھا لیتا تھا تو جب ہم رشین مارکیٹ پہنچے تو میں نے علیم سے پوچھا کہ گھر کھانے کا سامان کم ہے تو کچھ خرید لیا جائے تو میرے بھائی نے کہا کہ پہلے گوشت خرید لیا جائے میں نے پوچھا کہ کتنا گوشت خرید لیا جائے۔ مجھے یاد ہے میں نے سٹیل ٹاؤن تقریباً سات یا آٹھ سال رہتے ہوئے گزارے شاید ہی کبھی چھوٹا گوشت خریدا تو علیم نے کہا کہ آدھا بکرا میرے لئے یہ بات حیران کن تھی۔ کہنے لگا بادشاہ اس کا تکیہ کلام بادشاہ ہے میں تمہیں ایسا بھونا ہوا گوشت کھلا دوں گا کہ تم اپنی انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔ اس نے گوشت اپنی مرضی سے صاف کروایا۔ ہم پھر بیکری کی دوکان میں گئے اور وہاں سے منرل واٹر، جام، انڈے، ڈبل روٹی خریدی اور میری تنخواہ کا آدھا حصہ وہیں خرچ

ہو گیا۔علیم نے واقعی گھر آ کر وافر مقدار میں گوشت بھونا جو بہت ہی لذیذ تھا۔علیم اور نادیہ کراچی میرے پاس شاید تین دن رہے اور ہم نے کراچی کی بھی خوب سیر کی اور تصاویر تاریں پھر میری والدہ کا فون آیا کہ علیم کو فوراً لاہور بھیجو تو علیم لاہور چلا گیا۔

میں بھی اپنے والد مرحوم کے چالیسویں کے لئے لاہور پہنچ گیا جہاں ہم سب اکٹھے تھے۔ میری والدہ علیم کی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش تھیں وہ ان کی سب سے پہلی اورلڑکی پوتی تھی اور وہ ہے بھی بہت سلیقہ شعار اور پیاری ہے۔علیم بہادر نے یہاں بھی اپنی روٹین نہیں بدلی اور وہ یہ ہی سمجھتا رہا کہ وہ جرمن میں ہے اور اس معاملے میں میرا تایا زاد بھائی فہیم اس کا بھرپور ساتھ دیتا۔ایک مرتبہ وہ مدہوش ہو کر گفتہ کو برا بھلا کہنے لگا تو بڑی مشکل سے اس کو قابو کیا۔

جب میں کراچی واپس آ گیا۔دفتر سے واپسی کے بعد میں لان ٹینس ضرور کھیلتا جس میں شامل راجہ، لاشاری، خالد، شرما، انیس اور بٹ وغیرہ شامل تھے۔میں ماہانہ تقریباً پانچ سو روپے دیتے اور رات نو بجے تک کھیلتے کیونکہ کورٹ میں لائٹ کا بہت مناسب انتظام تھا۔مجھے دیکھ کر میرے ہمسایہ چندن لال اور خادم حسین کو بھی شوق ہوا کہ وہ بھی ٹینس کھیلا کریں اور فٹ رہیں۔دونوں حضرات میرے ساتھ کورٹ آئے اور زور و شور سے کھیلنا شروع کر دیا حالانکہ انہیں سمجھایا کہ آہستہ آہستہ کھیلیں تو چندن لال بال کو پک کرتے ہوئے گرا اور اپنی کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھا اور خادم حسین ایک ہفتہ تک بیمار رہے دونوں کی بیویاں ان کی اس حرکت پر بہت ہنسیں۔

پاکستان سٹیل ملز لاہور آفس تبادلہ 19-12-94

میری لاہور ٹرانسفر کا قصہ یوں ہے کہ ندیم کی شادی ہونے والی تھی اور اس کی بھرپور کوشش تھی کہ میں لاہور تب تک ٹرانسفر ہو جاؤں تاکہ اس کے کام آ سکوں تو ندیم کے ایک دوست چودھری شفیق کے ایک جاننے والے کرنل افضل تھے جو کیولری گراؤنڈ میں رہائش پذیر تھے ایک دن وہ کراچی میرے پاس آئے اور کہنے لگے بس اب تم لاہور جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔میں بھی چاہتا تھا کہ لاہور جاؤں مجھے گمان تھا کہ میں وہاں نوکری کے ساتھ ساتھ کوئی کاروبار بھی کر سکوں گا اور میرے مالی حالات اچھے ہو جائیں گے۔انہی کرنل افضل نے ہمارے چیئرمین سجاد حسین سے کافی دیر تک ملاقات کی اور سب لوگ حیران تھے کہ یہ کون صاحب ہیں جو اتنی دیر سے ملاقات کر رہے ہیں۔بعدازاں انہوں نے اس وقت کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ کرنل افضل ان سے بھی ملاقات کی دونوں کرنل حضرات آپس میں بہت گہرے

دوست تھے تو کرنل افضل نے انہیں کہا کہ مبین مجھے درخواست برائے ٹرانسفر لاہور دے دے تو وہ میری ٹرانسفر لاہور کروا دیں گے مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے درخواست دی تو مجھے TA/DA نہیں ملے گا تو ایک مرتبہ میں کرنل افضل سے ملا اور اسے ٹرانسفر کے بارے میں کہا تو اس نے مجھے کہا کہ درخواست دو میں نے کہا کہ اس پر تو مجھے TA/DA نہیں ملے گا تو اس نے کہا لاہور جانا چاہتے ہو کہ نہیں سو میں نے درخواست دے دی اور وہ میری درخواست لے کر خود چیئرمین کے پاس گئے اور اس سے ٹرانسفر کے آرڈرز کروا کر مجھے دیئے اور میں 99-12-19ء کو لاہور آ گیا بغیر فیملی اور ڈیوٹی جوائن کر کے ہفتہ کی چھٹی لے لی۔

ندیم کی شادی انٹرنیشنل ہوٹل لاہور میں بڑے شاہانہ انداز میں ہوئی۔ میری بیٹی مہر نے یہ شادی اٹینڈ کی اور گفتہ، سحر اور سارہ کراچی ہی تھے۔ میری والدہ نے انہیں مدعو بھی نہیں کیا تھا۔ اس طرح میں اس شادی میں بہت مصروف رہا اور میں نے تین ہزار روپے سلامی دی کیونکہ یہ ہمارے خاندان میں بھائیوں میں سے پہلی شادی تھی جس میں ہمارے تمام عزیز واقارب شامل ہوئے۔ شادی سے ایک دن قبل میں دلہن کے گھر گیا ندیم میرا بھائی بھی ساتھ تھا۔ اس وقت میری اور ندیم دونوں کی مونچھیں تھیں تو ندیم اندر کمرے میں کھانا کھا رہا تھا اور میں باہر دلہن کے والد صاحب کو مجھے دیکھ کر محسوس ہوا کہ میں آغا ندیم ہوں کیونکہ جیسے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری اس سے بہت شکل ملتی ہے انہوں نے کہا کہ دولہا بھائی آپ باہر کیوں کھانا کھا رہے ہیں اندر چل کر کھانا کھائیں تو میں سمجھ گیا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے تو میں نے گھر آتے ہی اپنی مونچھیں منڈوا دیں ندیم کی شادی میں کئی سیاسی راہنماؤں جن میں اجمل خٹک اور نیلم شاہ بھی شامل تھے اس کے علاوہ محمود بھٹی آف پیرس نے بھی شرکت کی۔

لاہور میں، میں نے ماڈل ٹاؤن ای بلاک میں کرایہ پر اینکسی لی جس کا کرایہ دو ہزار روپے تھا یہ گھر اکبر مومن کا تھا جو کہ محکمہ خوراک میں بڑے آفیسر تھے۔ گفتہ، سحر اور سارہ دو ماہ بعد کراچی سے لاہور آئے۔ میری والدہ اور ندیم کی مجھے تاکید تھی کہ میں انہیں لینے نہ جاؤں بلکہ وہ خود ہی آئیں تو ٹھیک ہے۔ تو میں نے ان کے کہنے کا پورا پورا پاس رکھا اور گفتہ اپنے بھائی تقدیس کی مدد سے پورے گھر کا سامان باندھے ٹرک میں لادے خود ٹرین سے لاہور آئی حالانکہ میں نے اسے آٹھ ہزار روپے بھیجے تھے تاکہ وہ بچوں کو جہاز میں لے کر آئے مگر اس نے بچت کی اور وہی بچت میرے ادھار اتارنے کے کام آئی۔

پیپلز پارٹی حکومت کا خاتمہ

صدر اسحاق خاں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کر دیا اور وزیر اعظم جتوئی کو بنا دیا گیا تو مجھے یقین تھا کہ اب مجھے ضرور نوکری سے نکالا جائے گا کیونکہ پاکستان کی یہ تاریخی ہے کہ جب کوئی حکومت سیاسی فہم ہوتی ہے تو آنے والی نئی حکومت ملک کی تمام بھرتیاں کی گئی حکومت کے ذمے لگا کر انتقامی کارروائی شروع کر دیتی ہے اور یہ ہی ہوا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں بھرتی کافی تعداد میں سٹیل ملز سے افسران کو نکال دیا گیا اور مجھے بھی یقین تھا کہ میں بھی ان میں شامل ہوں گا۔ میں نے احتیاطاً اس وقت کے ڈائریکٹر میجر نادر کے دفتر فون کیا جو کہ ان کے پی اے نے بتایا کہ میرا ان میں نام نہیں ہے تو مجھے اطمینان ہوا۔ اخباری خبر پڑھ کر میرے دفتر ساتھی قمر محمود سندھو، طارق اور شبیر وغیرہ افسوس کرنے آئے مگر میں نے انہیں نہیں بتایا کہ میرا نام نکالے گئے افسران میں نہیں ہے۔ وہ گفتگو کرنے لگے کہ اب آپ سامان وغیرہ کا کیا کریں گے؟ بلکہ مجھے طارق نے آفر کی کہ وہ کچھ سامان خریدنے کے لئے تیار ہے لیکن بعد میں انہیں علم ہو گیا کہ میں نوکری میں بدرجہ اتم موجود ہوں۔

اولڈ راوئیز ایسوسی ایشن کراچی

حکومت نے جنرل الیکشن کروانے اور میاں نواز شریف برسر اقتدار آ گیا تو اب بھی خطرہ سر پر سوار تھا کہ مجھے ممکن ہے ملازمت سے نکال دیا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس دور میں، میں اطمینان سے نوکری کرتا رہا اور میں کراچی میں اولڈ اوینز ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا اس کے روح رواں میاں ناصر مجھے بہت پرموٹ کرتے تھے بلکہ انہوں نے راوین میگزین میں میرا ایک لیٹر چھپانے میں میری مدد کی جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ اولڈ راوئیز کا دفتر کاشف سنٹر شاہراہ فیصل میں تھا اور اس میں ہم نے بہت پائے کے

پروگرام کئے۔ سالانہ ڈنر جو کہ شیرٹن ہوٹل میں ہوا ہم بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس میں شعیب ہاشمی، سلیم ہاشمی کے علاوہ خالد کھرل جو کہ پیپلز پارٹی کے منسٹر انفارمیشن تھے وہ بھی مہمان خصوصی تھے۔ ان کو جب میں نے بتایا کہ میں آغا نوید کا بھائی ہوں جو اس انفارمیشن منسٹری میں میڈیا کنسلٹنٹ تھا۔ خالد کھرل نے بے زاری کا اظہار کیا جبکہ شعیب ہاشمینے نوید کے بارے میں ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ آغا نوید عظیم باغی ہے۔ اس پروگرام میں ہم نے نصرت فتح علی خاں کو مدعو کیا ہوا تھا اور اس کے لئے منہ مانگی رقم بھی دی ہوئی تھی مگر وہ بوجہ ناسازی طبیعت پروگرام میں شریک نہ ہو سکے اور راحت علی نے وہ پروگرام کیا۔

کراچی میں اولڈ راوئیز کے ایک اور پروگرام کو میں نہیں بھول سکتا۔ اس پروگرام میں، میں نے ضمیر بٹ کو مدعو کیا تھا تو اس نے سارے پروگرام میں خوب ہنگامہ کیا۔ وہ شراب کے نشے میں ٹن بار بار کھڑے ہو کر کہتا کہ ہارون تم کہاں ہو اور سٹیج پر پرفارم کرنے والے فنکاروں کو ڈسٹرب کرتا بلکہ اس پرگرام کو اس وقت کے کور کمانڈر بنگش نے بھی اٹینڈ کیا اور یہاں تک نوبت آئی کہ اسے سکیورٹی والوں نے اٹھایا اور گیٹ کے باہر لے گئے۔ لیکن وہ پھر واپس آ گیا اور بار بار یہ ہی دہراتا ہارون تم کہاں ہو۔ سب اولڈ راوئیز نے پوچھا کہ ضمیر بٹ کو کس نے مدعو کیا ہے تو میں نے جواب دیا "میں نے"، تو وہ کہنے لگے آئندہ ایسے شخص کو کبھی نہ بلانا اور مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔

اولڈ راوئینز

پاکستان سٹیل کے چیئرمین سجاد حسین تھے جن کو قتل کر دیا گیا کراچی میں، تو مجھے میاں ناصر نے کہا کہ ہم اولڈ راوئنز کا ایک فنکشن سٹیل ملز کی اسٹین بیچ میں کرنا چاہئے جو کہ ایک پروگرام ہو تو مجھے کیا کہا کہ میں سجاد حسین سے اجازت لوں، تو میں ملا ان سے تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی بلکہ روامینز میگزین کے لئے ایک صفحہ کا سٹیل ملز کا اشتہار بھی دیا جو کہ پانچ ہزار روپے کا تھا۔ میں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی بہت کوشش کی اور سجاد حسین کا بھی بھرپور تعاون رہا۔ ہم نے پاکستان سٹیل آفیسرز کلب میں تمام شریک اولڈ اوینز کے فیملیز کا حلوہ پوڑی، لسی اور چنے کے ناشتہ کا وافر مقدار میں انتظام کیا جو کہ تقریباً تین سو کے قریب لوگوں نے کھایا اور بعد میں ہم سب بسوں میں بیٹھ کر رشین بیچ پہنچے جہاں ہم نے بہت انجوائے کیا۔ اس میں میری پوری فیملی تھی میرے ساتھ، ہم سٹیل ملز کی طرف سے واٹر ٹینک اور سکیورٹی کا پورا پورا انتظام تھا اور کھانا کا انتظام لاروش والوں نے کیا تھا۔ وہاں خوب مزے مزے

کے کھانے کھائے گئے میں نے سٹیل ملز کے۔

ڈاکٹر آفتاب کے علاوہ شبیر شاہ کو بھی مدعو کیا تھا جو نہ آیا مگر آفتاب اور اس کی فیملی بہت خوش ہوئے۔ہم نے وہاں ویڈیو بنائی اور تصویر کشی بھی کی۔ہم رشین بیچ چھ بجے تک رہے تو مجھے راوینز ایسوسی ایشن کے عہدیدار نے کہا کہ ہم آغا مبین کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس پروگرام کو کامیاب کرنے میں اتنی محنت کی اور مجھے کہا گیا کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں تو میں نے سب حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ I hope you would visit again اور سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا نہیں۔ہم رشین بیچ سے واپس آفیسرز کلب آئے جہاں ہم نے سب کی خاطر چائے سے کی اور یوں یہ پکنک اپنے اختتام کو پہنچی میں نے آفیسرز کلب میں یہ بینر بھی لگوایا تھا کہ Agha Mobeen welcomes Old Ravians and their families

اسلام آباد پلاٹ

17-6-1990ء کو مجھے اسلام آباد میں پرائم منسٹر کوٹہ سے پلاٹ ملا جو کہ سیکٹر 11E میں تھا ۔اس کا نمبر 223 اور پیمائش 272 فٹ تھی مجھے جب پلاٹ کے الاٹمنٹ کا لیٹر ملا تو میرے پاس قسط جمع کروانے کی رقم نہیں تھی۔ مجھے بڑا مان تھا کہ میں ارشد گھرکی سے کہہ کر قسط کی رقم ادا کر دوں گا مگر ارشد نے مجھے مایوس کیا اور کہا کہ یہ اونے پونے مجھے دے دو بہرحال میں نے اس پلاٹ کی پہلی قسط نوید اپنے چھوٹے بھائی سے لے کر ادا کی۔ بعد میں جب اس کی دوسری قسط کا مسئلہ ہوا تو اسی دوران میری اپنی ہمشیرہ ملیحہ سے بات ہوئی کہ میں یہ پلاٹ آپ کو دے دوں گا یعنی بیچ دوں گا تو انہوں نے دوسری قسط ادا کر دی۔ اگرچہ میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے سٹیل ملز سے قرضہ مل جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے پلاٹ کے پیپر اپنے بڑے بھائی آغا ندیم کے پاس رکھے ہوئے تھے تو اس نے اور نوید نے مل کر وہ پلاٹ کسی میجر کے پاس بیچ دیا اور الاٹمنٹ کے پیپر اس کو دے دیئے۔ مجھے اس بات کا دلی صدمہ ہوا۔ انہوں نے میجر سے پیپر دے کر پچاس ہزار روپے لے لئے تھے۔نوید نے مجھے کہا کہ کیونکہ میں نے اس کے عید کارڈز کے پیسے دینے تھے اس لئے وہ حساب برابر۔ان عید کارڈز کی زیادہ سے زیادہ قیمت دس ہزار تھی یوں نوید نے اپنی قسط والی رقم اور کارڈز کی رقم بمعہ منافع بیس ہزار مجھ سے وصول کر لیا۔ندیم نے میرے پلاٹ کے پیپر جسے دیئے تھے تو اس نے انہیں کیوں بیچا۔ مجھے دوبارہ پیپر بنوانا پڑے کیونکہ وہ میجر کسی مقدمہ الجھ گیا اور باقی کی رقم نہ دے کر معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پلاٹ سے دستبردار

ہو گیا۔اس طرح مجھے سی ڈی اے والوں نے دوبارہ ڈپلیکیٹ لیٹر جاری کر دیا۔ میری والدہ ڈنمارک سے کراچی میرے پاس آئی تو انہیں باجی ملیحہ نے تنبیہہ کی کہ مبین سے الاٹمنٹ لیٹر لے کر آئیں ورنہ کراچی ہی رہیں۔ میری ہمشیرہ ملیحہ نے مجھے میرے دفتر کراچی بھی دھمکی آمیز فون کیا کہ اگر تم نے سیدھی طرح پیپر نہ بھیجے تو میں تمہاری سٹیل ملز میں شکایت کر دوں گی۔ مجھے اس کے اس رویہ کا بہت دکھ ہوا۔ میں نے اپنی والدہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی الاٹمنٹ لیٹر دے دیا۔اس کے باوجود وہ پلاٹ میری ہمشیرہ کے نام نہیں ہوسکتا تھا جب تک میں سی ڈی اے میں جا کر خود مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہ ہوں تو میری ہمشیرہ نے مجھے کہا کہ ہم بیان دینے کے لئے اسلام آباد آجاؤ اور کرایہ وغیرہ میں دوں گی حالانکہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں جب وقار اور اپنی ہمشیرہ کے ساتھ اسلام آباد پہنچا تو وہ مجھے فوراً مجسٹریٹ کے پاس لے گئے کہ میں بیان دوں تو میں مجسٹریٹ کے کمرہ سے باہر آ گیا اور میں نے انہیں کہا کہ پہلے مجھے پیسے تو دو اس پر وہ دونوں بہت سیخ پا ہوئے اور ہم ہوٹل آ گئے۔ وہاں میری ہمشیرہ نے مجھے بہت دھمکیاں دیں اور مجھے کہا کہ ہوٹل سے نکل جاؤ میں وہاں سے نکل کر ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس گیا جس نے مجھے پلاٹ کی آفر ساڑھے چار لاکھ کی جبکہ میری ہمشیرہ مجھے صرف پونے دو لاکھ دے رہی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے ڈنمارک اپنی والدہ اور بھائی ولید سے بات کی تو ان دونوں نے مجھے کہا کہ تم ملیحہ کو پلاٹ نہ دو اور جہاں سے تمہیں زیادہ پیسے ملتے ہیں وہیں بیچ دو۔ مجھے خیال آیا کہ میں اسی ڈیلر کو بیچ دوں اور اس وقت مجھے پیسوں کی بھی اشد ضرورت تھی میں ہوٹل پہنچا تاکہ اپنا سامان لے سکوں تو وقار اور ملیحہ نے مجھے بہت پیار سے بٹھایا اور پوچھا کہ کچھ کھایا ہے کہ نہیں اور میں ان کی باتوں میں پھر آ گیا اور اگلے دن میں نے مجسٹریٹ کے سامنے ان کے حق میں بیان دے کر پلاٹ سے دستبردار کا اعلان کیا۔ لاہور آ کر باجی نے جب پیسوں کا حساب کیا تو کہنے لگی کہ ابا جان کی زندگی میں انہوں نے ہم سے ادھار لیا تھا پانچ ہزار روپیہ اور نوید بھی بیس ہزار دینے ہیں میں نے انہیں کہا کہ آپ کے جتنے پیسے بنتے ہیں وہ کاٹ کر مجھے حساب چکتا کریں تاکہ میں اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ میں نے اس بات کا ذکر سب بھائیوں سے کیا جو ڈنمارک تھے اور انہوں نے کہا کہ اچھا کیا جو تم نے سارا قرضہ اتار دیا۔ باقی میرے پاس جو رقم بچی اس میں سے نوید کو پچیس ہزار روپیہ مزید دیا کیونکہ وہ پاکستان سے جرمنی جانا چاہتا تھا۔

لاہور ہائیکورٹ آغا ندیم کی جگہ برائے ضمانت پیش

ندیم صاحب ڈنمارک سے پاکستان واپس پیپلز پارٹی کے پہلے دور میں آیا تو اس پر بہت

سے مقدمات تھے، جن میں اس کی ضمانت ہونا تھی تو آفتاب گل نے اسے مشورہ دیا کہ اپنی ضمانتیں کروا لوتا کہ گرفتاری سے بچ سکو تو ندیم نے لاہور ہائیکورٹ ضمانت کے لئے اپلائی کیا اس سے پہلے ندیم نے کہا کہ اگر میری ضمانت ہو گئی تو ٹھیک ہے ورنہ میری جگہ مبین گرفتار ہو گا اور میں تیار بھی ہو گیا۔ لاہور ہائیکورٹ میں جب ہم جج کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے تو مجھے انگڑائی آئی اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند انگڑائی لی تو جج سمیت مجھے کورٹ میں موجود لوگ دیکھنے لگے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ندیم کی ضمانت ہو گئی اور اس طرح میں گرفتاری سے بچ گیا۔

میں نے پلاٹ بیچنے کے بعد جو رقم تھی وہ حبیب بینک لکشمی چوک میں جمع کروا دی۔ ندیم نے مجھے لاہور سے کراچی فون کیا کہ وہ لاہور میں سٹی بینک سے گاڑی قسطوں پر لینا چاہتا ہے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ ڈاؤن پے منٹ دے سکے اسے معلوم تھا کہ میرے پاس بینک میں پیسے ہیں تو مجھے اس نے مزید کہا کہ تم مجھے 75 ہزار بھیج دو میں گاڑی کچھ استعمال کرنے کے بعد ڈنمارک واپس جلاؤں گا اور گاڑی تمہیں کراچی پہنچا دوں گا تم اسے اپنے استعمال میں لانا اور باقی اقساط میں ڈنمارک سے پیسے بھیج کر جمع کرواتا رہوں گا۔ میں نے اس پچاس ہزار کا چیک اور پچیس ہزار روپے اپنے بینک سے نکلوا کر دیا تا کہ وہ گاڑی قسطوں پر خرید سکے۔ جب دو تین ماہ ہو گئے اور مجھے ندیم کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو میں نے لاہور اپنی ہمشیرہ کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ندیم اور نوید جرمنی جا چکے ہیں اور مجھے اس کا علم بھی نہ تھا۔ ندیم کی اس بات پر مجھے دلی صدمہ ہوا۔

میاں نواز شریف کے دور اقتدار میں اعظم خاں قومی وفاقی وزیر کمیونی کیشن بنے۔ جن کا تعلق اے این پی سے تھا تو میرے بھائیوں کی سیاسی ساتھی شاہ اس پارٹی کی پنجاب کی خواتین ونگ کی صدر تھی اسنے مجھے کہا کہ اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ اس دور میں وزیر اعظم ٹرانسپورٹ سکیم متعارف ہوئی تھی اور کسی بھی گاڑی کا دس فیصد ڈاؤن پے منٹ کر کے گاڑی نکلوائی جا سکتی تھی۔ اگر وزیر سے اپروچ ہو تو سٹیل ٹاؤن میں آڈٹ ڈیپارٹمنٹ کے آفسر ملک انور یار نے مجھے مشورہ دیا کہ اسکیم سے استفادہ حاصل کیا جائے تو میں نے شاہ سے لاہور میں بات کی تو وہ اس پر راضی ہو گئی کہ وہ منسٹر سے آرڈر کروا لے گئی مگر اس کے لوازمات پورا کرنا ہوں گے تو میں نے یہ بات ان کو بتا دی۔ اس سکیم سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے پانچ افراد شامل ہو گئے جن سب کا تعلق میرے سواسر گودھا سے تھا اور وہ ملک برادری تھے۔ اس میں میرا بھی حصہ تھا یعنی ایک بس 42 سیٹرز کے لئے میں نے بھی کچھ رقم دی تھی

ہم لوگ لاہور آئے اور شاہ کو درخواست کے ساتھ مبلغ ایک لاکھ دیا اور کچھ دنوں کے بعد میں منسٹر ہوتی کے آرڈرز مل گئے اور ہم اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کوچز نکلوائی جائیں اور جب کافی عرصہ گزر گیا کوچز نہ نکلیں تو وہ سب لوگ جو سکیم میں شامل تھے اور میرے سخت خلاف ہو گئے۔ اس ضمن میں، میں یہ بتا تا چلوں کہ میں نے شاہ کو پیسے دینے سے پہلے ندیم سے پوچھا تھا تو اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ شاہ ضرور کام کروا دے گی۔ اس نے آرڈز تو منسٹر سے کروا دیئے مگر ہمیں کوسٹر نہ مل سکیں ہم نے اس سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے آرڈرز کروانے تھے اور وہ میں نے کروا دیئے اور رقم آپ کو واپس نہیں مل سکتی۔ ملک برادری نے سٹیل ٹاؤن میرے فلیٹ پر ہنگامہ برپا کر دیا اور مجھے ان کو پچیس ہزار روپے پہلے سے دینا پڑا اور مجھے ان لمبے تڑنے لوگوں کی دشمنی بھی مول لینا پڑی انہوں نے مجھے جان سے مارنے کی بھی دھمکی دی۔ لیکن جب انہیں پچیس ہزار مل گئے تو انہیں کچھ تسلی ہوئی کہ یہ رقم باقی کی بھی دے گا۔

میری تیسری بیٹی سارہ فاطمہ کو پولی کلینک سٹیل ٹاؤن میں پیدا ہوئی مجھے اس کی پیدائش کا سن کر پسینے آ گئے۔ اس لئے کہ ہمارے معاشرہ میں لڑکی کی پیدائش کو پسند نہیں کیا جاتا۔ مجھے سارا فاطمہ اپنی بیٹوں میں بہت عزیز ہے اور مجھے اس پر بہت پیار آتا ہے ایک مرتبہ لاہور آفس میرے عید کارڈ زکسی نے رکھا ہے تو مجھے اس پر غصہ آیا تو میں سیدھا اس وقت کے جنرل منیجر بریگیڈیئر اعجاز کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ عید کارڈز کیا تم نے اپنی Beloved کو لکھا تو میں نے فوراً جواب دیا۔ My Kids are My Beloved

چیئرمین میجر جنرل صبیح قمر زمان

نواز شریف کے دور اقتدار میں پاکستان سٹیل کا چیئرمین میجر جرنیل صبیح قمرالزماں کو بنا دیا گیا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت سخت چیئرمین ہے۔ ان کا تبادلہ واہ کینٹ سے پاکستان سٹیل ہوا تو سنا ہے واہ کے لوگوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ جب صبیح قمرالزماں نے سٹیل ملز جوائن کی تو اس وقت یونائیٹڈ ورکرز فرنٹ ایم کیو ایم کی سی بی اے سے تھی۔ جس کا پوری سٹیل ملز پر کنٹرول تھا بلکہ چیئرمین شجاعت بخاری کو خالد مرتضیٰ، چیئرمینسی بی اے آڈر کرتا تو وہ یعنی شجاعت بخاری، خالد مرتضیٰ کے دفتر آنا پڑتا اور سارا کنٹرول اس کا تھا۔ اس طرح ایم کیو ایم عروج پر تھی۔ ایم کیو ایم نے اس دور میں اپنے بہت سے ورکرز بھرتی کئے۔ ان میں زیادہ تر جعلی دستاویزات پر بھرتی ہوئے۔

چیئرمین صبیح قمرالزماں نے اپنے پہلے خطاب میں جو کہ ایم ٹی سی میں ہوا، صاف الفاظ میں بتا دیا کہ چیئرمین سٹیل ملز کا ایک ہی چیئرمین ہے اور وہ میں ہوں۔ ایم کیو ایم نے اس بیان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ پہلا بھی جرنیل تھا یعنی بخاری اور اسے بھیہم دیکھ لیں گے مگر صبیح قمرالزماں نے انہیں ایسا سیدھا کیا کہ سب کو لائن میں لگا دیا اور جو لیڈران کسی کی بات نہیں مانتے تھے یونیفارم پہن کے آنے لگے اور نوکری کرنے لگے ان کی لیڈری ختم ہوگئی۔ صبیح قمرالزماں نے سٹیل ملز میں ڈسپلن پیدا کیا اور یونائیٹڈ ورکرز فرنٹ کے بھرتی شدہ 205 ملازمین کو نکال باہر کیا۔ اس سپیشل ڈیوٹی میں مجھے بھی شامل کیا گیا اور میں نے اس کام کو بہت عمدگی سے کیا اور ڈیوٹی آورز کی بھی پرواہ نہیں کی بلکہ رات نو نو بجے تک اس کام میں مصروف رہا۔ اس کام کرنے کے بدلے میں مجھے پھر ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی اور مجھے Personal Files Checking Committees Coordinator بنا دیا گیا اس کمیٹی کے ممبر بننے کا مجھے ایک فائدہ ہوا کہ مجھے سٹیل ملز میں بھرتی افسران کی تعلیمی قابلیت اور ان کی اسے بھرتی ہوئی تو معلوم ہوا کہ پاکستان سٹیل ملز میں 90 فیصد سے زیادہ افسران کسی نہ کسی کی سفارش پر بھرتی ہوئے۔ اس طرح مجھے تسلی ہوئی کہ میں اکیلا ہی سفارشی نہیں ہوں بلکہ آوے کا آوا ہی سفارشی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے سینئر افسران کی کیا تعلیم قابلیت ہے۔ میں اس کی تفصّل میں نہیں جانا چاہتا اس سے کئی افسران کا پول کھل جائے گا۔

مجھے صبیح قمرالزماں کے دور میں دوبارہ جونیئر افسر بنا دیا گیا حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے سیکشن میں سب اے ایم سے زیادہ کام کرتا اور میری انگریزی کی قابلیت عملی طور پر ان سے زیادہ تھی اسی دور میں افسران کا پروفائل ٹیسٹ ہوا جو کہ اے ایم کے لئے تھا حالانکہ اس وقت مجھے تو جے او بنا دیا گیا مگر میں نے اے ایم کا ٹیسٹ جونیئر آفیسر ہوتے ہوئے بھی پاس کر لیا بلکہ دو مرتبہ یہ ٹیسٹ پاس کیا۔ مجھے یاد ہے اس وقت کے جنرل مینیجر نور اے نبی نے ایک نوٹ پر یہ لکھا کہ پی پی سیکشن میں سوائے جونیئر آفیسر یعنی راقم باقی سب افسران انگلش میں بہت غریب ہیں۔

صبیح الزماں کے دور میں میجر امتیاز ہمارے بلاک L25 میں رہائش پذیر تھے تو انہوں نے مجھے ایک مرتبہ اپنے دفتر واقع سنٹرل لیبارٹری بلایا اور مجھے بٹھا کر چائے کا کپ پیش کیا اور مجھے کہا کہ میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتا ہوں تم بتاؤ کہ پاکستان میں سب سے مضبوط ادارہ کون سا ہے اور میں نے فوراً جواب دیا کہ آرمی تو اس نے کہا بالکل ٹھیک اور پھر سٹیل ملز کے بارے میں باتیں شروع ہوگئیں بعد

میں میجر امتیاز کی چیئرمین شیخ الزماں سے اختلاف ہوگیا اور وہ واپس چلا گیا۔

جب ہم بیرک نمبر آٹھ منتقل ہوئے تو کچھ عرصہ بعد وہاں لنچ کے وقت یونائیٹڈ ورکرز فرنٹ کے لیڈران جن میں رشید خاں اور جہانگیر وغیرہ شامل تھے وہ ہمارے دفتر آئے اور سارا اہم ریکارڈ اٹھا کر لے گئے۔ اس موقع پر دفتر میں وکیل مس لبنیٰ اور دیگر ورکرز دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے جب وکیل نے انہیں اندر آتے دیکھا تو وہ نکل گیا اور انہیں ریکارڈ لے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ میں نے اس واقعہ کی رپورٹ کی اور انکوائری کا سلسلہ شروع ہوگیا جو کہ صبیح الزماں کے دور میں ہوا اور اس کیس میں خورشید خاں، جہانگیر اور سلیم بھائی کو نوکری سے ڈسمس کر دیا گیا۔ ملزمان نے انکوائری اٹینڈ ہی نہیں کی۔ بعدازاں انہوں نے اس انکوائری اور ڈسمس کے خلاف لیبر کورٹ میں اپیل کر دی اور مجھے بحیثیت گواہ پاکستان سٹیل کے نمائندہ وہ کورٹ انکوائری اٹینڈ کرنا پڑی۔ میں کورٹ اکیلا جاتا اور مجھے کورٹ میں بہت سے ایم کیوایم کے کارکنوں کی دھمکی آمیز نظروں کا سامنا کرنا پڑتا۔ میری ٹرانسفر پر یہ کام مامون خاں کو دے دیا گیا یوں میری جان خلاصی ہوئی۔

پاکستان سٹیل ملز میں یونائیٹڈ ورکرز فرنٹ نے ہنگامہ کیا تو ان پر فائرنگ کی گئی جس کے نتیجے میں ایک کارکن ہلاک اور خالد ٹانگوں سے معذور ہوگیا۔ سٹیل ملز نے اسے علاج کے لئے لندن بھجوایا مگر اس کی ٹانگیں کاٹنی پڑی اور وہ ہمیشہ کے لئے معذور ہوگیا جس کا مجھے سخت افسوس ہوا۔

میرے ساتھ لان ٹینس میں کیپٹن فرخ بھی شامل ہوگیا۔ وہ قمرالزماں چیئرمین کے ساتھ جو ٹیم تھی اس میں شامل تھا اس کے علاوہ میجر انور، کرنل انور بھی جو پاکستان سٹیل میں چیئرمین کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کیپٹن فرخ فٹ بال کھیلنے کے بعد ٹینس کھیلتا اور وہ بہت ماہر تھا۔ میں نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ میری تقرری چیف پلیسمنٹ بیورو کے ذریعے ہوئی ہے وہ جب ڈبل میں میرا ساتھی ہوتا تو مجھے زور دے کر کہتا کہ Kill the ball مگر میں ہمیشہ کی طرح آرام اور سوچ سمجھ کر شارٹ کھیلتا۔ صبیح الزماں کے دور میں بھی مجھے خطرہ تھا کہ مجھے نکال دیا جائے گا تو ایک مرتبہ مجھے بشارت اور میاں سکیورٹی ڈپٹی منیجر نے پیغام دیا کہ میجر انور کا کہنا ہے کہ مبین کو تسلی دو کہ اسے نکالا نہیں جائے گا یوں مجھے تسلی ہوگئی۔

پیپلز پارٹی کا یہ دور بھی گزشتہ دور کی طرح بہت پرآشوب رہا اور قمرالزمان صبیح سابق چیئرمین پاکستان سٹیل کے دور میں نکالے گئے۔ تمام افسران اور ورکرز کو بحال کر دیا گیا۔ بہرکیف اس دور میں بھرتیاں کم ہی ہوئیں۔ صبیح الزماں کے بعد پاکستان سیٹل کا چیئرمین ڈاکٹر فنانس سجاد

حسین کو بنا دیا گیا صبح لاہور آفس نے پیپلز یونین کے جیتنے کی خوشی میں شمشاد قریشی اور دیگر عہدیداران کو استقبالیہ دیا اور طعام کا انتظام شعب ملک نے کیا جو کہ بہترین تھا اس تقریب میں نے بھی شرکت کی اور وہ اتنے مختلف کھانے دیکھ کر حیرانگی کا اظہار کیا اور خوب سیر ہو کر کھایا اس تقریب میں خالد گھرکی نے بھی شرکت کی۔ پہلے شعیب ملک اور افضال شاہ نے کوشش کی کہ وہ حنیف رامے یا شیخ رفیق کو مدعو کریں مگر جب آخری وقت تک نہ آئے تو مجھے 16 ایف سی سی جا کر خالد گھرکی سے درخواست کرنا پڑی جو وہ مان گئے اور اس طرح لاہور آفس کی عزت رہ گئی۔

میاں نواز شریف کی اسمبلی کو اسحاق خاں نے ختم کر دیا تو میاں نواز شریف نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی اور کورٹ نے اسمبلی کی بحالی کا آڈر دے دیا مگر پھر فوج نے بذور شمشیر یعنی طاقت کے استعمال سے استعفیٰ لیا گیا۔ یوں میاں صاحب کو حکومت سے نکال دیا۔ معین قریشی کیئر ٹیکر پرائم منسٹر ہوئے اور انہوں نے تین ماہ کے بعد الیکشن کروائے اور پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آ گئی پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے سے مجھے قوی امید ہو گئی کہ اب میں دوبارہ اے ایم بن جاؤں گا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی صبیح قمر الزماں چیئر مین رہے اور انہوں نے سیاسی دباؤ نہ لیا اور اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ سنا ہے جب ان کی ریٹائرمنٹ کا وقت ہوا تو پیپلز پارٹی انہیں بحیثیت چیئر مین توسیع دینے کے لئے تیار تھی، مگر یونیفارم کے بغیر جو کہ انہوں قبول نہیں کیا۔ اس طرح پاکستان سٹیل کے فنانس ڈائریکٹر سجاد حسین چیئر مین بن گئے۔ اس طرح پھر سے پاکستان سٹیل فر میں سیاسی افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔ مجھے کچھ عرصہ کے بعد بحالی کمیٹی کا ممبر بنا دیا گیا اور دھڑ دھڑ پھر سے بھرتیاں ہونے لگیں۔ میرے بھائی آغا ندیم کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اس کی منگنی میں بھی میں نے شرکت کی تھی۔ ندیم کی پسند کہیں اور تھی اور شادی کہیں اور ہوئی۔ اس سے پہلے ندیم کا نام میری خالہ زادہ بن رضیہ کے ساتھ لیا جا رہا تھا مگر بوجہ ایسا نہ ہو سکا۔

پاکستان سٹیل لاہور تبادلہ

میری لاہور ٹرانسفر بتاریخ 94-12-19 کو ہوئی میں نے جوائننگ مورخہ 94-12-24 کو۔ پاکستان سٹیل کے زونل سیلز آفس لاہور میں میرا پہلا دن وہاں پہلے سے متعین لوگوں تعارف میں گزرا۔ جس میں بریگیڈ یئر اعجاز انچارج، محمد اکرم ہوتی، رضی قریشی، اکرم بھٹی، اور آزاد نعیم وغیرہ سے کروایا گیا میں لاہور آفس پہلے دن سوٹ پہن کر گیا تھا تا کہ اچھا تاثر دوں۔ انچارج

زونل سیلز آفس لاہور مرحوم بریگیڈ یئر اعجاز نے مجھے آفس میں بلایا اور مجھے کہا کہ ڈائریکٹر مارکیٹنگ نے تمہاری بہت تعریف کی ہے اور امید ہے تم اس اچھی ریپٹیشن کو برقرار رکھو گے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا مجھے چند دنوں بعد انچارج پرسنال بنا دیا گیا اور شفقات اللہ کو کراچی ہیڈ آفس ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اس کی ٹرانسفر کی وجہ اس کا مزدور دشمن رویہ تھا اور اس وقت پیپلز ٹریڈ یونین کی سی بی اے تھی اس لئے بذریعہ سیاسی دباؤ کراچی ٹرانسفر کر دیا گیا۔ مجھے بریگیڈ یئر اعجاز نے انچارج پر مسائل ہی بناتے ہوتے کہا کہ اس دفتر میں تم میرے جی ایم ہو اس طرح وہ مجھے خوش کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میری تقرری چیف ڈویلپمنٹ بیورو کی وجہ سے ہوئی ہے ہماری پیپلز پارٹی میں سرگرمیوں کا بھی اسے پوری طرح علم تھا۔

ایک مرتبہ مجھے بریگیڈ یئر اعجاز نے دفتر بلایا اور مجھے کہا کہ ہم تمہیں Protection Projection اور Promotion دیں گے اگر تم ہمارے ساتھ کام کرو۔ میں اس وقت یہ بات نہ سمجھ سکا مگر اب سمجھ میں آئی ہے۔ مجھے نعیم نے بتایا کہ اُن کا تعلق ایک خاص کمیونٹی سے ہے۔

لاہور ٹرانسفر ہونے کے بعد میں نے اپنے بڑے بھائی آغا ندیم کو کہا کہ وہ پاکستان سٹیل سے ڈیلر شپ لے لے اور اس طرح اس کو لاہور میں اچھا کاروبار کرنے کا موقع ملے گا مگر اس نے یہ بات نہ مانی البتہ شاہ کے لئے کہا کہ اسے ڈیلر شپ لے دوں۔ بہر حال نصر اللہ دریشک نے بنام سنی کو ڈیلر شپ لے لی اور وہ اس سلسلے میں بریگیڈ یئر اعجاز سے بھی ملا۔ جب یہ ڈیلر شپ مل گئی تو چونکہ نصر اللہ دریشک ایک سیاسی شخصیت تھے اور ان کے منظور وٹو چیف منسٹر پنجاب سے اچھے تعلقات تھے تو انہیں سٹیل ملز سے جی پی پراڈکٹ کی اچھی Allocation ہونے لگی تو اس میٹریل کو میں ڈیل کرتا اور جتنی بھی ڈیل ہوئی وہ امجد ڈیلر سے ہوئی جو دوسرے ڈیلرز کی نسبت Fair تھا کاروباری لحاظ سے یوں میں اسے این او آر دے دیتا اور وہ اس وقت کے مارکیٹ کے نفع کے مطابق مجھے پیسے دے دیتے۔ اس میں سے یعنی نفع سے میں آدھا نفع خود رکھتا اور باقی نصف شاہ کو دے دیتا اس طرح میں نے وہ نقصان پورا کرنے کی کوشش کی جو مجھے گاڑیوں کی یعنی کوچوں کی ڈلیوری نہ ہونے سے ہوا تھا۔ میری لاہور ٹرانسفر بتاریخ 19-12-94 کو ہوئی میں نے جوائننگ مورخہ 24-12-94 کو جس دوران سجاد حسین چیئرمین پاکستان سٹیل تھے تو راقم کو پروٹوکول کی ذمہ داری بھی دی گئی تو اس دوران بروز عید راقم اور گزر گیا تھا۔

چوہدری غفور نے شمشاد قریشی اینڈ فیملی کو لاہور ایئر پورٹ ریسیو کیا اور وہ بعد ازاں اپنے

آبائی گاؤں سرگودھا بذریعہ گاڑی روانہ ہو گئے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ سابق چیئرمین سجاد حسین لاہور بہت آتے جاتے تھے اور مجھے میاں جاوید کے ساتھ ایئرپورٹ پر ریسیو کرنا ہوتا تھا اور پھر ہم انہیں کے ان کے گھر واقعہ گلبرگ لے جاتے۔ اسی دوران محمود بھٹی فرانس سے لاہور آیا ہوا تھا اور ہوٹل پرل کونٹی نینٹل میں فیشن شو منعقد کروا رہا تھا۔ چیئرمین سجاد حسین کے صاحبزادہ عباس کو میاں جاوید کے ذریعے معلوم ہوا کہ محمود بھٹی مبین کا دوست ہے تو عباس نے مجھے کہا محمود بھٹی کے فیشن شو کے مجھے دو پاس دو۔ محمود بھٹی مجھے اور ندیم کو دو پاس دے چکا تھا جو میں نے عباس کو دے دیئے اور جب محمود سے مزید دو پاس دینے سے انکار کر دیا اور اس نے مجھے کہا کہ تمہیں وہ پاس عباس کے لئے نہیں تمہارے لئے دیئے تھے ۔اس لئے اب مزید پاس اس کے پاس نہیں ہیں۔ قبل ازیں محمود بھٹی نے آواری ہوٹل میں فیشن شو منعقد کیا تو مجھے دو پاس دیئے۔ اس وقت وہ آواری ہوٹل میں اپنی ماڈلز کے ساتھ براجمان تھا جن کی تعداد بیس کے قریب تھی وہ فیشن شو میں نے نوید کے ساتھ آواری کے لان میں دیکھا تمام ملبوسات یورپین ڈیزائن تھے۔ اس کے باوجود وہاں پاکستانی مرد و خواتین کا بہت رش تھا تو مجھے محمود بھٹی نے کہا کہ یہ تمام ملبوسات جو میں نے ڈیزائن کئے ہیں یورپین ہیں مگر دیکھو برگر فیمیلیز کس شوق و ذوق سے یہ فیشن شو دیکھنے آئیں ہیں۔ اس فیشن شو میں آواری کے منیجر نے پاکستانی ماڈل کو ماڈل آف دی شو کا تاج پہنایا اور اس ماڈل نے محمود بھٹی کا کس کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اس ماڈل کا نام زویا تھا۔

پروٹوکول ڈیوٹی کے دوران ایک مرتبہ راقم بیگم سجاد حسین کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تو ان کی نواسی بھی ان کے ہمراہ تھی۔ ایئرپورٹ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ فلائٹ لیٹ ہے۔ وی آئی پی لاؤنج میں، میں اور میاں جاوید اس بچی کو بہلاتے رہے تو وہاں خالد گھر کی جو کہ اس وقت ایم این اے تھے وہ بھی اسلام آباد جانے کے لئے وہاں پہنچے۔ اس نے مجھے بچی کو بہلاتے ہوئے دیکھ لیا اور پوچھا کہ یہ کس کی بچی ہے میں نے بتایا چیئرمین سجاد حسین کی نواسی ہے اس نے مجھے فوراً کہا کہ تمہیں پیپلز پارٹی والوں نے یہ کیسی نوکری دی ہے لاہور آفس میں ہر کردار منفرد تھا مگر اکبر پاٹھی ان سب میں نمایاں تھا وہ ہمیشہ کلف والی شلوار قمیض پہنتا اور جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے اس دفتر کے بارے میں پوری تفصیل بتائی اس نے مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ وہ دوپہر کا کھانا حامد ناصر چٹھہ جو کہ مسلم لیگ فنکشن کا صدر اور نہایت اہم سیاسی مقام رکھتا تھا اس کے گھر کھانا ہے میں اکبر پاٹھی سے بہت متاثر ہوا کہ اس کے تعلقات ایسے لوگوں سے میں مجھے بہت اصرار کر کے حامد ناصر کے گھر لے

گیا اور مجھے کہا کہ آپ لان میں رکیں میں ابھی دیکھتا ہوں کہ کھانا تیار ہے کہ نہیں اور میں لان میں کھڑا اس کے اخلاق و حسن سلوک کا دل ہی دل میں معترف ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک دو ملازموں کے ساتھ باہر آیا اور بتایا کہ آغا میں معذرت چاہتا ہوں کہ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دفتر واپسی پر مجھے عبداللہ نے بتایا کہ اکبر پاٹھی کے تعلقات حامد ناصر سے نہیں بلکہ اس کے باورچی سے ہیں اور وہ اسے کبھی کبھار بچا کھچا کھانا کھلا دیتا ہے۔

ایک دن ہم سب دفتری ساتھی صحن میں صبح کے وقت کھڑے تھے تو میاں جاوید کے ناک کے عین اوپر پھنسی نکل آئی جس سے اس کا ناک سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے ناک پر پھنسی کی وجہ سے سخت تکلیف ہے تو اکبر پاٹھی نے میاں جاوید کی ٹی سی کرتے ہوئے فوراً کہا کہ میاں تکلیف تو بجا لیکن یہ آپ کو لگ بہت بھلی رہی ہے۔ اس طرح وہاں موجود سب دوستوں نے بہت لطف اٹھایا۔

میاں جاوید ڈپٹی منیجر اور میں ماڈل ٹاؤن رہتے تھے اس کے علاوہ آزاد نعیم پرانا ماڈل ٹاؤن کا رہائشی تھا۔ راقم اور میاں جاوید کو ورزش کا شوق ہوتو چونکہ میاں کے پاس بحیثیت پروٹوکول آفیسر سٹیل ملز کی گاڑی تھی تو وہ مجھے صبح کے وقت گاڑی پر ماڈل ٹاؤن پارک جو کہ بہت وسیع اور لاہور کے خوبصورت پارکوں میں سے ہے تو ہم وہاں گاڑی پارک کر کے گراؤنڈ کے چکر لگاتے مگر میاں جاوید جلد تھک جاتا تو اس نے مجھے کہا کہ یار میرا پیٹ کیسے کم ہوگا تو میں نے از راہ مذاق کہا میاں اگر آپ نے پیٹ جلد از جلد کم کرنا ہے تو اس کُتے طرح دوڑ لگائیں جو کہ ہمارے قریب سے تیز دوڑتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے میاں جاوید کو میں نے جوگر شوز دیئے تاکہ وہ اپنے پرانے اور گھسے پٹے جوگرز سے نجات پائے تو میاں اعجاز نے جوگرز بدلتے ہوئے کہا کہ لڑکیاں میرے خوبصورت پاؤں دیکھ کر مجھ پر عاشق ہو جاتی تھیں تو میں نے فوراً کہا کہ جب ان کی نظر آپ کے چہرے پر پڑی ہوگی تو ان کا عشق رفو چکر ہو جاتا ہوگا۔ موصوف واجبی شکل وصورت کے تھے۔

شمشاد قریشی پیسہ بنانے میں مصروف رہا اور کبیر تمنا جو کہ پیپلز یونین کا عہدیدار تھا سی بی اے کے چارٹر آف ڈیمانڈ پر کام کرتا رہا۔ اس کا رویہ بحیثیت سی بی اے عہدیدار بہتر تھا۔

مجھے یاد ہے جب چیئرمین سجاد حسین کو معلوم ہوا کہ اسے چیئرمینی سے ہٹایا جا رہا ہے تو اس نے شمشاد قریشی سے کہا کہ اس کارروائی کو رکواؤ اور شمشاد قریشی اس سلسلے میں شیخ رفیق اور ناہید خاں کو اپروچ کرتا رہا تاکہ سجاد حسین کا چیئرمینی کا عہدہ برقرار رہے مگر ایسا نہ ہو سکا اور سجاد حسین کی جگہ عثمان

فاروقی کو چیئرمین پاکستان سٹیل مقرر کر دیا گیا۔

واقعہ ایڈمنسٹریٹرز ماڈل ٹاؤن

جب میں ماڈل ٹاؤن ای بلاک میں رہائش پذیر تھا تو میری والدہ، نوید ماڈل ٹاؤن اے بلاک میں کرایہ کے اپر پورشن میں رہتے تھے۔ وہیں نوید اور وسیم کی شادی ہوئی۔ ماڈل ٹاؤن سوسائٹی جس کا ایڈمنسٹریٹر رانا خالد تھا ہم اس کے دفتر گئے تا کہ اس سے لائٹنگ کے بارے میں این اوسی لیں تو وہ ہمیں دفتر اور گھر دونوں جگہ نہ ملا۔ اس کے دفتر والوں نے کہا کہ آپ الیکٹریشن کے گھر جائیں تو وہ آپ کو لائٹنگ کا انتظام کر دے گا مگر وہاں بھی نہ ملا۔ جس رات مہندی تھی تو جیالے نے کسی الیکٹریشن کے ساتھ مل کر مین لائن سے لائٹنگ کے لئے کنکشن لے لیا جس کا سوائے جیالے کے کسی کو علم نہ تھا۔ جیالا نوید کا ملازم تھا جو کہ پیپلز پارٹی کا سرگرم کارکن تھا اور نوید کے دستہ بازو تھا۔ جب مہندی کی تقریب عروج پر تھی تو رانا خالد ایڈمنسٹریٹر بمعہ عملہ وہاں پہنچ گیا اور اس نے اپنے عملے کو حکم دیا کہ بجلی فوراً کاٹ دو ہم سب نے اس سے بہت درخواست کی کہ ایسا مت کرو۔ اس سے آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے ہماری بے عزتی ہوگی مگر وہ نہ مانا اس نے بجلی کا کنکشن مین سے کٹوا دیا تو اندھیرا ہو گیا۔ اس اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسیم کے "ان لاز" جو کہ بدمعاشی میں نامور تھے انہوں نے رانا خالد کو بری طرح زدوکوب کرنا شروع کر دیا اور قریب تھا کہ اس کی حالت غیر ہوتی اس نے اپنے عملے کو حکم دیا کہ کنکشن بحال کر دو اور یوں دوبارہ لائٹنگ تو ہو گئی، لیکن وسیم کے ان لاز نے اسے گاڑی میں ڈال کر نامعلوم جگہ لے گئے اور ہمیں اس وقت اس بات کا علم ہوا جب پولیس شادی والے گھر پہنچ گئی اور ہمارے پرانے ملازم صدیق کو پکڑ کر لے گئی جو کہ فیصل آباد سے نوید اور وسیم کی شادی دیکھنے آیا تھا۔ وسیم اور نوید نے ہالیڈے ان میں کمرے بک کروائے ہوئے تھے اور انہیں پولیس کے چھاپہ کے بارے میں ہماری صبح ملاقات پر علم ہوا۔ رانا خالد نے ایف آئی آر آغا نوید کے نام درج کروائی تھی اس پر اغواء، بجلی چوری اور دیگر مقدمات میں بلاوجہ ملوث کر دیا۔ جب نوید کی سیشن کورٹ میں مجسٹریٹ کے پاس ضمانت کے لئے حاضری ہوئی تو مجسٹریٹ نے پوچھا کہ آغا نوید کہاں ہے ہم نے بتایا کہ وہ معذور ہے اور دونوں ٹانگیں اس کا وزن اٹھانے قاصر ہیں اور پھر نوید کو دونوں بازوؤں سے سہارا دیتے ہوئے مجسٹریٹ کے پاس پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے نوید کی یہ حالت دیکھی تو اس نے فوراً کہا کہ ایک معذور شخص کیسے کسی تندرست و توانا آدمی کو اغوا کر سکتا ہے اور گویا ہوا کہ

اس نے ضرور یعنی رانا خالد نے رشوت نہ ملنے کی وجہ سے نوید پر اغوا کا مقدمہ درج کروایا ہے اور نوید کی ضمانت ہو گئی۔ بعد میں نوید کو کبھی ماڈل ٹاؤن اور کبھی واپڈا کی کی عدالت واقع کشمیر روڈ پیش ہونا پڑتا۔ ضمانت کا کیس مجسٹریٹ کے روبرو احمد بلال صوفی نے پیش کیا۔

جب وسیم ڈنمارک واپس چلا گیا تو اس کی گاڑی میرے پاس رہی اور میں اس گاڑی میں اپنی والدہ اور بھابی نوشین کو ان کے کاموں کے سلسلے میں لے کر آتا جاتا اور دفتر بھی گاڑی پر جاتا تو میں ماڈل ٹاؤن سے جاوید رضوی آزاد نعیم اور بلوچ کو ان کے گھروں سے اٹھاتا اور واپسی پر انہیں وہاں جہاں سے اٹھاتا تھا چھوڑتا۔

وسیم کی شادی نوشین بٹ سے اور آغا نوید کی شہناز سے طے پائی۔ گاڑی وسیم نے شادی کے لیے خریدی تھی وہ گاڑی ہم نے بجی ماموں سے خریدی اس کی قیمت سوا لاکھ روپے تھی۔ میں نے وسیم اور نوید کی شادی کے دوران دفتر سے چھٹیاں لے لیں اور زیادہ وقت وسیم اس کی بیوی اور وسیم کے ڈینش دوست یان کو سیر کروانے کے لئے گاڑی چلاتا رہا بلکہ پہلی مرتبہ میں نے لاہور سے اسلام آباد تک گاڑی چلائی۔ یان میرے ساتھ اگلے ولی سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ وسیم اور نوشین پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ یان راستہ میں مجھے گائیڈ کرتا رہا کہ میں ایسے گاڑیوں چلاؤں مجھے وسیم نے کہا کہ میں اپنا پاسپورٹ ساتھ لے جاؤں جو میرے پاس تھا۔ یوں نوشین بھابی کے ساتھ میں میں نے بھی ڈنمارک کے ویزا کے لئے اپلائی کر دیا اس سلسلے میں ہان نے ہم دونوں کی بہت مدد کی اور ہمارا انٹرویو بھی نہ ہونے دیا حالانکہ نوشین بہت پریشان تھی کہ نا معلوم انٹرویو میں کیا پوچھیں۔ وہاں یان نے میری اور نوشین بھابی کی تصویر بھی کھینچی۔ ان دنوں نوید اپنی بیوی کے ساتھ اسلام آباد بحیثیت بینظیر اس وقت کی وزیر اعظم کا میڈیا ایڈوائزر تھا۔ نوشین بھابی کا خیال تھا کہ نوید کا عالی شان گھر ہوگا لیکن اسے مایوسی ہوئی کیونکہ اس کے گھر کی حالت ایسے ہی تھی۔ اسلام آباد سے وسیم، یان اور وسیم کے ان لاز بھوربن روانہ ہو گئے جبکہ میں وہاں کچھ دن رہنے کے بعد واپس لاہور آ گیا۔ نوید وسیم کی شادی علیم میرا بڑا بھائی جو عرصہ پچیس سال سے جرمنی رہ رہا ہے اس نے بھی جرمنی سے آ کر اٹینڈ کی۔ اس کے علاوہ سمعیہ اور اس کے دونوں بیٹوں نے بھی شرکت کی۔

وسیم جب واپس ڈنمارک چلا گیا اور نوید بھابی شہناز کے ساتھ اسلام آباد تو میری ذمہ داری بہت بڑھ گئی بلکہ میں نے اپنے بیوی بچوں کو بالکل نظر انداز کر کے امی جان اور نوشین بھابی کی

خدمت پر مامور ہو گیا۔ نوشین بھابی کو اس کے گھر لے جانا۔ اس کے اور امی جان کے کام کرنا میرے معمولات میں شامل ہو گیا۔ ایک مرتبہ میں وسیم کی گاڑی میں بھابی نوشین جو کہ اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں اور امی جان پیچھے والی سیٹ پر تو میں اپنے گھر ای بلاک بچوں کے پاس آیا تو گفتہ نے جب مجھے نوشین بھابی کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو وہ اُلٹے قدم واپس اندر چلی گئی اس کے چہرے کے تاثرات بہت ناگوار تھے۔ بعد میں میرا اس کا اس بات پر جھگڑا بھی ہوا اور میں نے اسے رشتوں کی پہچان پر لیکچر دیا۔ اسی دوران میری بچیاں مجھ سے بہت نالاں تھیں اور انہوں نے اس کا تحریری اظہار بھی کیا۔ ماڈل ٹاؤن ہم نے اپنی بچیاں امینہ اور مہر کو پہلے سکول داخل کروایا بعد میں گول چکر ای بلاک میں آئیڈیل مسلم سکول میں داخل کروایا جو کہ ایک ریٹائر بریگیڈیئر سلیم چلاتے تھے۔ سارہ فاطمہ نے بھی میری تیسری بیٹی نے اپنا پہلا سکول وہی جوائن کیا۔ ای بلاک والا گھر اکبر علی کا تھا جو کہ محکمہ زراعت میں اعلیٰ افسر تھے مگر ان کا طرز زندگی بہت سادہ تھا۔ ان کا ایک بیٹا عرفان اور چار بیٹیاں تھیں۔ ہمیں یہ مکان جاوید رضوی نے لے کر دیا جو کہ میرے دفتر کا ساتھی اور ہمسایہ بھی تھا مکان میں چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا اور اس کا کرایہ دو ہزار ماہانہ تھا اور کچھ عرصہ رہنے کے بعد اس میں پانچ سو روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ میری والدہ بھی ماڈل ٹاؤن اے بلاک میں اپر پورشن پر رہائش پذیر تھیں۔

ڈنمارک کا ویزہ

22 اپریل 1996ء کو میرا ویزہ برائے ڈنمارک آ گیا جو کہ ایک ماہ کے لئے تھا گفتہ میرے ویزہ ملنے پر خوش نہیں تھی۔ میں نے اپنے دفتر سے ایکس پاکستان چھٹی کے لئے اپلائی کر دیا جو کہ انچارج سیلز محمد اکرم ہوتی نے بہت مشکل سے فارورڈ کی اور ہیڈ آفس کراچی میں جب اسے پروسیس ہونے میں زیادہ وقت ہو گیا تو میں نے کراچی جی ایم گردیزی سے بات کی تو انہوں نے مجھے بذریعہ فیکس ایکس پاکستان چھٹی کا میمو بھیج دیا۔ اب مجھے ٹکٹ کی فکر لاحق ہوئی تو امی جان وغیرہ نے فیصلہ کیا کہ جب میں ڈنمارک چلا گیا تو وسیم کی گاڑی کوئی نہیں چلائے گا تو اسے بیچ دیا جائے۔ اس پر نوید کا مجھ سے بہت جھگڑا ہوا اس کی خواہش تھی کہ وہ گاڑی بیچ کر ساری رقم اپنے پاس رکھوں اور مبین یعنی راقم ٹکٹ کے پیسے کہیں اور سے کا بندوبست کرے۔ بہرحال وہ گاڑی ججی ماموں کے پاس نوے ہزار روپے میں بیچی اور اس میں سے میرے حصے پینتیس ہزار آیا جس سے میں نے ڈنمارک سے واپسی ٹکٹ خریدی۔ بھابی نوشین کو

بھی بہت ملال ہوا کہ گاڑی ان کے شوہر یعنی وسیم کی تھی تو اس کی رقم پر ان کا حق تھا۔ ان کہ یہ بھی دکھ تھا کہ مبین کا ویزہ آ گیا ہے مگر ان کا نہیں۔ وسیم نے مجھے فون پر کہا کہ میں نوشین بھابی کو ساتھ لے کر ڈنمارک آؤں جبکہ میری ہمشیرہ ملیحہ اور والدہ نے مجھے کہا کہ میں اکیلا جاؤں اور نوشین الگ جائے تا کہ میں اس کا سامان لے کر نہ جا سکوں جو کہ اس کے جہیز کا تھا۔ مجھے اس بات کا سخت ملال ہے کہ وسیم کی غیر موجودگی میں، میں نے نوشین کا بہت خیال رکھا اور اس کے بینک اکاؤنٹ پاسپورٹ ہر کام میں بہت مدد کی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وسیم میرے لئے ٹکٹ کے پیسے بھیج رہا ہے تو اس نے وسیم کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ مجھے ٹکٹ کے پیسے نہ بھیجے۔ یہ بات وسیم نے مجھے خود بتائی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بھابی نے وسیم کو یہ بات ذہن نشین کروائی کہ شادی کے بعد بھائی بہن کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور سب رشتے مفادات کے ہوتے ہیں اور وسیم نے اس بات کا بہت برا منایا۔